UNIVERSAL
LIBRARY
OU_226027
UNIVERSAL
LIBRARY

رسالہ

ہدیۂ سنیہ بالدر البہیہ

از مولانا نور محمد صاحب مدیر رسالہ صراط مستقیم حیدرآباد دکن

یعنے تمہید سنت متعلق بہ مواعظ ثلاثہ ملقبہ بہ

افادۃ العباد فی مواعظ حیدرآباد

کہ منجملہ افادات حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی صاحب دام ظلہم العالی

وہم لطیف ترین مصادیق شعر حافظ شیرازیؒ است ؎

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ میرود

وین بحث با ثلاثہ غسالہ میرود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً۔ ناظرین کرام آپ کی بلند اقبالی اور خوش نصیبی ہے کہ بارہ تیرہ اوراق کے بعد آپ کو حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ دام فیضہ کے مواعظ ملیں گے جو محض موہبات ربانی اور مفاوضات رحمانی کی دستگیری سے اس قسم کے کلام کی توفیق ہو سکتی ہے جس میں شاہراہ شریعت کے ساتھ ساتھ معارف و حقائق کے دریا

بہہ رہے ہیں۔ نہیں بلکہ کشتی در دریا رواں و دریا در کشتی موجزن ہے۔ اس ذات قدسی ملکات کا تھانہ بھون سے حیدرآباد فرخندہ بنیاد خلدہ اللہ میں تشریف فرما ہونا کوئی آسان امر نہیں تھا۔ یہ صرف ہم پیاسوں کی خوش نصیبی اور خوش وقتی تھی کہ خود دریائے فیض و کرم ہم پیاسوں کے پاس آیا اور بہت سے لب تشنگان بادیہ طریقت کو اپنے زلال برکات و خیرات سے سیراب و شاداب فرمایا۔ الا هتك الله ستره ونهلت قلبه حضور انور کی ہمیشہ سے عادت مبارک ہے کہ حتی الوسع رؤسا و دنیا داروں کی جانب دعوت پر بھی سفر نہیں فرمایا کرتے جبتک کہ کوئی شرعی قوی داعی نہ ہو۔ چنانچہ دس سال قبل اپنے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب مدیر رسالہ النور تھانہ بھون کی شادی کیواسطے نظام آباد تک سفر فرمایا تھا۔ اور بطور تفریح صرف ایک روز کے لئے حیدرآباد بھی تشریف لائے تھے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی اور اسی روز واپس لے گئے۔ چنانچہ بعض امراء کے پاس سے دعوتیں بھی آئیں مگر حضور نے نہایت حسن واخلاق کے ساتھ ٹال دیا۔ حیدرآباد دکن میں چونکہ جناب حبیب الملت عا قب الکبیرہ حضرت مولانا حکیم عبدالرحمن صاحب ابقاہم اللہ فیوضہم خود بزرگ اور بزرگ زادہ[ع] ہیں اور ان کا وجود مسعود بطور یادر فتگان باقی ہے جو مستفضین کیلئے بسا غنیمت ہے۔ اور بمصداق قطب از جا نمی جنبد ہمیشہ خانہ دوز و زاویہ نشین ہیں وہ ہیں اور ان کا سجادہ زبان ہے کہ مشین کی طرح بے صورت کلام الٰہی کے الفاظ کی تلاوت ہر وقت کر رہی ہے اور دل ہے کہ اس محبوب کی یاد میں معلق ہے۔ ان اسباب کے علاوہ کبر سنی کی وجہ سے زیادہ دور سفر کے قابل بھی نہیں رہے۔ آپ کی بہت عرصہ سے تمنا تھی کہ حضرت مجدد الملت ادام اللہ انوارہ سے کبھی ہم کلامی صوری کا شرف حاصل ہو۔ اور فرط محبت وعقیدت سے اکثر صادر و وارد سے حضرت کے مزاج اور حالات کا استفسار فرمایا کرتے تھے۔ مگر اتفاقات حسنہ ازبسکہ نادر الوجود اور کمیاب ہیں۔ ایک مدت سے ایسا موقع ہاتھ نہ آیا۔ اس اثنا میں معارف آگاہ اخوی مولانا عبدالحی

عہ لانہ ابن لمولانا احمد علی المحدث السہارنفوری رحمۃ اللہ علیہ ۲۔

صاحب ابقاہ اللہ استاذ شاہزادگان والا تبار و پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ کی اہلیہ محترمہ جو ایک عرصہ سے علیل اور دائمۃ المرض ہیں۔ اُن کی خواہش ہوئی کہ میری زندگی معرض خطر میں ہے۔ اگر حضرت مجدد الملۃ سے شرف بیعت نصیب ہو جاوے۔ تو مجھے سعادت دارین حاصل ہو جائے گی۔ بنا ءً علیہ صاحبہ موصوفہ کی درخواست جس کے ساتھ حضرت حکیم صاحب دام فیضہ کی ذاتی تمنا بھی شامل تھی۔ حضرت کی خدمت اقدس میں پہونچادی گئی۔ حضرت نے اپنے اس اصول سے کہ شفقت علی عامۃ الخلق ایک اہم انسانی فریضہ ہے بلا کسی عذر کے قبول فرمالیا۔ اس کے بعد بعض ضروری شروط کا تصفیہ ہوا۔ اور خاص حضرت کی ذات بابرکات کے لئے سیکنڈ کلاس کا کرایہ اور ہمراہی خادم کے لئے تیسرے درجہ کا کرایہ معہ ضروری سفر خرچ بھیجا گیا۔ و نیز خود حضرت اقدس بھی اس کے متمنی تھے کہ جناب مولٰنا حکیم صاحب کی زیارت سے محظوظ ہوں۔ یہ بھی ایک قوی وجہ تھی انکار نہ کرنے کی۔ اور تاریخ ورود حیدرآباد ۲۳ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ قرار پائی۔ مگر حضور کا ارشاد تھا کہ میرے آنے کی اطلاع اور شہرت عام نہ ہو۔ ان غلاموں نے تو پوری تعمیل کی۔ بھلا آفتاب پر کہیں پردہ پڑ سکتا ہے۔ اس کے دوسرے روز ہی لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ ہر شخص آتا اور پوچھتا کہ حضرت کس تاریخ کو تشریف فرما ہوں گے۔ باوجود اخفا کے لوگ پتہ لگا ہی لیتے۔ دو روز کے اندر تمام شہر میں اس کونہ سے اُس کونہ تک ایک ٹھنڈوری پڑگئی۔ یہ وہ شہرت نہیں تھی کہ پیروں نے بغیر دعوت کے اپنے مریدوں کو اپنی آمد کی خبر دی۔ اور مریدوں نے قبل از ورود اشتہار چھاپ دیا۔ قیام گاہ کا پتہ۔ وقت ملاقات۔ کہاں وعظ ہوگا۔ غرض ہر چیز کو واضح کرکے شائع کر دیا۔ بلکہ یہ وہ شہرت ہے جو اللہ جل جلالہ کی جانب سے متبعان سنت نبوی کو وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے خزانہ سے عنایت ہوتی ہے۔ جس میں نہ اشتہار کی ضرورت ہے اور نہ ڈھنڈوری پیٹنے کی حاجت۔ نہ پتہ اور نشان بتانے کی محتاجی خود بخود شہرت ہوتی ہے۔ خود بخود مشتاق دلوں کا گروہ ڈھونڈ ہتا پتہ لگاتا ہوا آکر قدموں پر گرتا ہے۔ یہ سب چیزیں تکمل نقص ہیں۔ جس کو ظاہر میں علامات

کمال سمجھتے ہیں۔ ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید   پیراں نمی پرند مریداں می پرانند

۲۳ ذی الحجہ کے انتظار میں بیسیوں بلکہ بے تاب سیکڑوں روحیں تڑپ رہی تھیں نکلنے کے لئے ماہی بے آب تھیں۔ ایک ایک گھڑی مہینوں اور برسوں سے زیادہ بوجھل معلوم ہوتی تھی۔ تصور ورخیال کے عالم میں دل میں ہزاروں ملاقاتیں ہزاروں مکالمے ہو جاتے تھے۔ اندر ہی اندر دل خیالی منصوبوں میں مزہ پر مزے لیتا تھا لیکن جب چونکا تو اُس کی مایوسانہ حالت قابل رحم ہوتی تھی خدا خدا کرکے بارے وہ روز سعید یعنے ۲۳ ذی الحجہ کا دن بھی آپہونچا لوگوں نے شیا شب ریل پر جانے اور سکندرآباد پر استقبال کرنے کی تیاریاں کیں۔ چنانچہ ان لوگوں میں سے یہ کمترین خادم بھی تھا۔ میں یہ سمجھا تھا کہ سکندرآباد پر جاتے ہیں میں ہی سابقوں میں سے ہوں گا لیکن جب گجرم نام پلی کے اسٹیشن پر پہونچا تو میری ندامت اور حیرت کی حد نہ تھی۔ کیونکہ مجھ سے پہلے بہت سے لوگ وہاں پہونچ چکے تھے۔ اسیطرح سکندرآباد پر اور بھی لوگ پہلے سے موجود تھے۔ دل میں رشک ہوا مگر کیا کرنا ہار چکا تھا۔ السابقون السابقون اولئك المقربون ؕ۔ اس وقت اسیکو غنیمت سمجھا کہ ان کے زمرہ میں صورۃً تو شامل ہوگیا ہوں۔ معنےً شامل ہونا خدا تعالے کی قبولیت پر منحصر ہے (والحمد للہ علی ذالک)

غرض سکندرآباد میں دنوں کے انتظار کے بعد اب گھنٹوں اور منٹوں کا انتظار کرنا پڑا۔ کیا کہوں اور جو کہوں گا وہ ہوگا سچ واللہ یقول الحقّ وہ ایک منٹ کوہ ہمالیہ کی مونٹ ایورسٹ سے بھی زیادہ وزنی معلوم ہوتا تھا۔ ہاں اس وقت طول قیامت کا فلسفہ خوب سمجھ میں آیا۔ آنکھیں تھیں لین کے آہنی پٹوں کے ساتھ سل گئی تھیں اگر اجیا نا اٹھیں تو سگنل کے تختہ پر جا چپکیں۔ کان ریل کی سیٹی کے انتظار میں اس قدر محو تھے کہ دوسرے کے پکارنے کی بھی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ اسی انتظار میں ناگہاں سیٹی سنائی دی اس آواز نے دلوں پر کیا اثر کیا اسکا جواب عارف رومی

قدس سرہٗ دیتے ہیں۔ سہ

یا چو بانگ رعد ایام بہار — میرساند باغ را چندیں نگار
یا چو بانگ صور اسرافیل شد — مردہ را زاں زندگی تحویل شد
یا چو بوئے یوسف خوب لطیف — میزند بر جان یعقوب نحیف
یا چو بوئے روضۂ دار السلام — سوئے عاصی میرسد بے انتقام
یا ز لیلےٰ بشنود مجنوں کلام — یا رساند دلبری رامی را پیام

اس آواز دلکش سے رگوں میں خون دوڑنے لگا بیسیوں دل خوشی سے پھول گئے بانسوں اُچھلنے لگے۔ جس قدر گاڑی نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ بے تابی بڑھتی جارہی تھی فرط خوشی سے پاؤں میں لرزہ آگیا۔ آنکھوں نے تلاش کیا ہاتھ اُٹھے انگلیوں نے رہنمائی کی۔ وہ وہ کی آواز سے ایک شور بپا ہوگیا۔ لمبی نظریں کوتاہ ہوگئیں ادب سے جھک گئیں۔ نہیں نہیں وہ بدر روح کمال ناگہاں برآمد ہوگیا۔ آنکھیں چندھیاں گئیں نظریں خیرہ ہوگئیں۔ یعنے وہ شہباز فضائے شریعت و دین وہ رہنمائے دنیا و دین وہ شیر بیشۂ معرفت و یقین۔ وہ پیشوائے اصحاب حق الیقین۔ وہ شہسوار شاہراہ طریقت وہ سابق مضمار حقیقت۔ وہ خضر گم گشتگان ہاموں ضلالت۔ وہ واقف اسرار لدنی۔ وہ ماہر کلمات خفی و جلی غوث زمان و قطب دوران حضرت مولٰنا الحاج الحافظ القاری شاہ اشرف علی تھانوی حکیم الامۃ ومجدد الملۃ ادام اللہ ذاتہ وبرکاتہ مادامت ارضہ و سمٰواتہ گاڑی سے باہر تشریف لائے۔ ہائے وہ سماں بھی کیا دل آویز تھا۔ ابتک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ ایک وہ دن تھا کہ انتظار تھا۔ انتظار میں ہر گھڑی ہر لحظہ برسوں کے برابر معلوم ہوتا تھا۔ رات ہوتی تھی یا شیطان کی آنت اُس وقت اُس رات سے زیادہ مبغوض شئے کوئی نہ تھی۔ مگر آج ہم ہیں کہ اس لیل و نہار کو یاد کرکے ترستے ہیں دل بھر آتا ہے۔ اگر ضبط کریں تو پھانس پر ایک کو ایسا بنکر رہ جاتا ہے۔ وہ گھڑیاں اس وقت کس قدر عزیز معلوم ہوتی ہیں۔ یاد کرتا ہوں اور ترستا ہوں۔ مگر

وہ کہاں برق تھیں یا باد اب صرف تصور رہے اور خیالی تصویر میں بس میں ہوں اور اس کی یاد۔ ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ۔۔۔ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

یاد کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔ ؎

چہ شد آں جوشش رنگ شرابم ۔۔۔ چہ شد آں محفل نقل کبابم
چہ شد آں سوزش رنگ شبابم ۔۔۔ چہ شد آں وفا ہائے اضطرابم
چہ شد آں جرعۂ بزم نشاطم ۔۔۔ چہ شد آں غنچۂ در انبساطم
چہ شد آں یاد لیلے یا و محمل ۔۔۔ چہ شد آں دشت آں شور سلاسل
چہ شد آں لذت آغاز الفت ۔۔۔ چہ شد آں طرفہ رمز و کنایت
چہ شد آں روز ہائے دل گدازم ۔۔۔ چہ شد آں سوز ہائے شب درازم
چہ شد آں جلوہ یک تازہ بینی ۔۔۔ چہ شد آں دیدہ بس دور بینی
بلے سرسبز بود آں کشت آمال ۔۔۔ کہ بر ما بود فضل رب متعال
ندانم من چہ بودم من چہ ہستم ۔۔۔ نمی دانم چہ باشم باز دستم

میرے دوست جو اُس روئے پُر جمال کے عشق کا دعوی رکھنے میں ممکن ہے کہ میرے اس جملہ پر معترض ہوں کہ اپنی خصوصیت کیوں۔ سب کا یہی حال ہے۔ ہاں مجھے انکار نہیں ہوگا اور ضرور ہوگا مگر معذور ہوں اُس روئے پر جمال کا سراپا لکھ رہا ہوں۔ دل سوز سے مالا مال ہے۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر ضبط ہاں ضبط سے گھٹکر رہ گئیں۔ پس کر سیاہ ہو گئیں۔ قلم کے راستہ سے نکل رہی ہیں۔ میں بے خبر ہوں مجھ جیسے بد نصیب اور بھی ہونگے یا صرف فراق کا مرثیہ سمجھنے والا میں ہی ہوں۔ واقعہ ہے ظن اور تخمین نہیں حسن ظن اصحاب فطنت و ارباب خبرت کا شیوہ ہے مگر میں ہاں مجھے جنوں ہے رقیبوں کی ادعا کی تصدیق سے دست بردار ہوں۔ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم ۔۔۔ گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

اس کے بعد پھر اس گاڑی میں حضور انور کی معیت میں یہ کمترین غلامان و دیگر خدام

کانچی گوڑہ کے اسٹیشن آئے جہاں حضور کو اُترنا تھا۔ اثنار راہ میں نہایت شفقت اور محبت کا سلسلہ رہا۔ اثنار گفتگو میں کسی کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ بھائی کرایہ تو سکنڈ کلاس کا بھیجا گیا تھا۔ اور میں اس میں سفر کر سکتا تھا۔ مگر ہم لوگوں کو راحت تو تھرڈ کلاس ہی میں ملتی ہے کیونکہ اس میں جو لوگ ہوتے ہیں وہ ہمارا پاس و لحاظ کرتے ہیں اور جو سکنڈ کلاس میں لوگ ہوتے ہیں وہ ہم سے ہی اس کے متمنی ہوتے ہیں کہ ہم اُن کا پاس و لحاظ کریں اور وہ بھی خوش قسمتی سے اگر مسلمان ہوئے۔ ورنہ بعض اوقات نہایت اجنبی اور غیر جنس سے سابقہ پڑجاتا ہے اور بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ پھر اب کے سفر میں تو نہایت راحت رہی ہمارے اس درجہ میں ابتدا سفر سے کوئی نہیں آیا۔ آرام سے سوتے ہوئے آئے اگر کوئی آیا بھی تو بیچارے نے معلوم نہیں کس خیال سے اندر آنے کا قصد نہیں فرمایا یہ خدا تعالےٰ کی شفقت اور رحمت تھی کہ آرام سے پہونچایا۔ پھر فرمانے لگے کہ اس ریاست کے حدود میں جب داخل ہوا تو اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے دل میں نورانیت پیدا ہوئی۔ اور انبساط پیدا ہوگیا۔ اور دل سے دعا نکلی کہ خدا اس ریاست کو سلامت و برقرار رکھے۔ یہاں کے لوگوں کے نہایت سنجیدہ اخلاق ہیں بہت ہی حلیم اور مہذب ہیں رعایا کی خوبیاں دراصل بادشاہ کے اخلاق سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں تو بڑے ہی مغرور اور متکبر لوگ ہوتے ہیں۔ خصوصاً ریل میں بڑی تکلیف دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے دکن کے لوگ متواضع اور دوسرے کی راحت کو مقدم رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں مجھے اس کا تجربہ ہوچکا ہے۔ جب کانچی گوڑہ پہونچے تو پلیٹ فارم پر مشتاقان دیدار کا ہجوم تھا۔ اور بہت سے معززین اور امرار پیشوائی کے لئے حاضر تھے۔ آپ گاڑی سے اُترے حضرت حکیم صاحب اور حضرت مفتی صاحب[عہ] سے مصافحہ فرمایا اور خصوصیت کے ساتھ باقی سب کے ساتھ یکساں برتاؤ تھا۔ کسی غریب پر کسی امیر کو ترجیح نہ تھی۔ سواری حضرت حکیم صاحب مدظلہ کے دولت خانہ پر

عہ۔ یعنی جناب مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند و مفتی ریاست حیدرآباد۔ ۱۲

پہونچے اور وہیں قیام فرمایا۔ ہر وقت محفل قدسی میں مشتاقوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ہر شخص سے ملاقات نہایت سادہ سنت سنیہ کے مطابق ہوتی تھی۔ نہ قدم بوسی نہ قیاصرہ اور اکاسرہ کی طرح لوگ مؤدب اور دست بستہ رہتے تھے۔ نہ دوکانداروں کی طرح دور ہی سے قدمبوسی کے لئے پانوں بڑھایا جاتا تھا گرمی محفل کے لئے نہ نغمے تھے نہ زمزمے۔ بلکہ ان حرکات سے سخت نفرت تھی کسیکو اظہار جذبہ یا وجد کی اجازت نہ تھی نہ کسیکو یہ یارا تھا کہ رقص کرے اور دھڑام سے پیر صاحب کے قدموں پر گر پڑے بلکہ اگر کسی سے کوئی حرکت خلاف سنت ہوئی تو فوراً روک دیا۔ اور نہایت عمدہ طریقہ سے اولاً اس کی تفہیم کردی اس کے بعد بھی اصرار ہوا تو سختی سے ڈانٹ دیا۔ کسی چھوٹے بڑے امیر غریب میں امتیاز نہیں تھا۔ شان فاروقیت[ع] پورے طور نمایاں تھی (لا یخافون لومۃ لائم) آپ کی محفل میں ہر شخص کو حقوق مساوات حاصل تھے مگر اس قدر امتیاز کے ساتھ جو سنت نبوی میں پایا جاتا ہے۔ خدا جانے وہ محفل با ملاء اعلیٰ کی انجمن تھی۔ سہل اور مختصر الفاظ میں وہ وہ معارف اور نکات بیان ہوتے تھے کہ گلا کاٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن ہر بات اور ہر حرکت رنگ شریعت غرا اور اتباع سنت علیاء میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی۔ اللہ اکبر کیا طرز تھا۔ انجمن آرائی کا کیا سلیقہ تھا فراست کہوں یا کشف کہوں یا الہام ربانی کہوں۔ ہر شخص آشنا نہ آشنا کے سلیقہ طبیعت اور جادہ فطرت کے لحاظ سے مکالمہ ہوا کرتا تھا۔ ہر شخص کے سوال کا جواب اس طرح ہوتا تھا کہ گویا اُس کے منہ کی بات کہدی گئی۔ بعض باطن پوش لوگوں کی تو فطرت ہی کھل جاتی تھی۔ عادات و خصائل نمایاں ہو جاتے تھے۔ ہر شخص یہ جان جاتا تھا کہ حضور اس کے دل کی تہ سے ڈوب کر نکلے ہیں اور اکثر اوقات انسان دل میں بعض باتوں کے دریافت کرنے کا تہیہ کر کے آتا۔ مگر بغیر سوال کے اثناء گفتگو میں اس کے تمام سوالات کے جواب مل جایا کرتے تھے۔ بعض احباب حسن ظن کی وجہ سے اکثر اوقات اس کمترین خدام کو گفتگو میں واسطہ بنایا کرتے تھے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے پہونچنے سے ضمیر صافی پر گرانی ہو اور میں خائب و خاسر ہو جاؤں (نعوذ باللہ منہ)

ع اشارۃ الی السنیہ

کیونکہ شیخ کی گرانی سے فیضان بند ہو جاتا ہے۔ مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس دریائے رحم و کرم نے میری لغزشوں پر نظر نہ فرمائی۔ اور دامان مقصود کو مالا مال فرمایا۔ ہر سوال کا شافی جواب ہر بات کی تشفی بخش توجیہ فرمادی۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میرے ایک معزز کرم فرما نے سود کے متعلق حنفی مذہب کا رویہ دریافت فرمایا اور بیچ میں مجھے واسطے سنایا مجھے تامل ہوا نہیں چاہتا تھا کہ عام مجلس میں اس مسئلہ کو چھیڑا جائے کیونکہ غبی لوگوں اور کوتاہ نظروں کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا اقرب تھا۔ مگر اصرار ایسا کہ مجھے پوچھتے ہی بن پڑی لیکن تو ریکر ساتھ اور دل میں یہ تمنا تھی کہ خدا کرے حضور مجھے روک دیں وضاحت نہ ہونے پائے حضور اس خطرہ سے شاید آگاہ ہو گئے اور میرے سوال کے جواب میں آپ نے بھی تو ریہ فرمایا۔ لیکن خود سائل نے صراحت سے سوال کیا۔ جس کے بعد تو ریہ ناممکن تھا۔ اس پر حضور نے جواب دیکر مجھ سے خطاب فرمایا کہ میں اس کے جواب میں وضاحت کرنا نہیں چاہتا لیکن اصرار کی وجہ سے مجھے جواب دینا پڑا۔ مجھے اس سے بہت ندامت ہوئی مگر خوش بھی ہوا کہ مزید وضاحت نہیں ہونے پائی۔ اور چونکہ آپ کو یہ علم ہو گیا تھا کہ میں محض واسطہ بالجبر ہوں اس لئے بچ گیا۔ آپ کی مجلس اور مجلس آرائی کا بعینہ وہی طور تھا جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی و عرضی و اہلی و مالی کا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجامع میں ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ کوئی اکتا جائے جمائیاں لینے لگے مگر شیخ صاحب ہیں کہ اپنی مشیخت کے جمانے میں تصوف ہانک رہے ہیں۔ وحدۃ الوجود کی زڑ لگائے جا رہے ہیں۔ اور لطف یہ کہ خود نہیں سمجھے۔ ٹھنڈی سانسیں ہیں آہوں پر آہیں نکل رہی ہیں کوئی یہ سمجھے کہ حضرت کا سینہ عشق الٰہی سے کباب ہو گیا ہے۔ مگر یہاں تو ضبط کا یہ عالم تھا کہ مجال نہیں کہ زبان سے یا حرکات و سکنات سے شمہ بھر بھی ظاہر ہو جائے۔ ہاں آنکھیں سرخ ڈورے پھولے ہوئے چڑھی ہوئیں۔ ہاں جذب کے دریا موجزن تھے۔ اختیار نہ تھا ورنہ یہ بھی نہ ہوتا۔ ہر مبصر یہ سمجھ سکتا تھا کہ اتباع سنت کا کس قدر آپ کو خیال ہے۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ

حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہمکو اگر نصیحت اور موعظت بھی فرماتے تو اس کا خیال ضرور ہوتا کہ ملال نہ پیدا ہو (یتخولنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بالموعظۃ مخافۃ السامۃ) مزاح اور خوش طبعی حسنہ سے دل بہلاتے ہمارے ہر رنگ میں (بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہوتا) آپ شریک ہو جاتے اگر ہم دنیاوی معاملات میں گفتگو کرتے تو شریک۔ گذشتہ لوگوں کے قصے اور کہانیاں کہتے تو شریک۔ غرض ہر طرح سے ہماری دل بہلائی اور دلجوئی فرماتے۔ اسی طرح آپ کی مجلس شریف میں بھی ہر طرح کے مذاکرے و مکالمے ہوتے تھے۔ سب ہی قسم کی باتیں ہوتی تھیں ہر بات میں شرکت تھی۔ لیکن دائرہ شریعت سے ایک اینچ ہٹنا محال تھا۔ اس سفر میں آٹھ بجے صبح اس قسم کی مجلس میں رونق افروزی ہوتی تھی بجز ارشادات دلپذیر و لطائف علمی و دیگر اقسام کی گفتگو کے اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد خاصہ تناول فرمایا کرتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد پھر مجلس افروزی ہوتی تھی۔ لیکن اس [redacted] ساتھ ڈاک کا جواب بھی لکھا جاتا تھا اور مختلف قسم کے مکالمات بھی ہوا کرتے تھے لیکن نہایت دلچسپ ادھر ڈاک کا جواب بھی مکمل۔ مطائبات اور حکایات بھی مکمل۔ ہر شخص کے سوال کا جواب بھی مکمل۔ پھر لطف یہ کہ قلم چل رہا ہے۔ تحریر جاری ہے تقریر جاری ہے تامل اور سوچنے کا موقع نہیں سب چیزیں فی البدیہہ اور بالارتجال جاری ہیں دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں سنا کرتے تھے کہ مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی قدس سرہٗ جامع النظرین تھے ایک جانب تدریس جاری رہتی دوسری جانب تالیف۔ مگر یہاں آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ خطوط بھی ایک نہیں دو نہیں چار نہیں ایک اچھا خاصہ بنڈل۔ پھر مختلف طبائع کے خطوط۔ مختلف سوالات مختلف حالات اس میں درج ہوتے ہیں۔ جو لازماً انہیں خصوصیات کے لحاظ سے قلب پر مختلف اثرات ڈالنے والے۔ کسی سے قبض و انقباض۔ کسی سے بسط و انبساط کسی سے رنج کسی سے فرحت۔ مگر یہاں اتنی گہرائی اور وسعت تھی۔ کہ ان چیزوں کا

پتہ بھی نہ لگتا تھا۔ بھلا بحر بے پایاں میں برگ و کاہ چہ حقیقت دارد۔ اور ان خطوط میں سب سے اہم وہ خطوط ہوتے تھے اور تعداد بھی اُنھیں کی زیادہ ہوتی تھی۔ جو مریدین سالکین کے لکھے ہوئے ہوتے تھے جس میں اُن کے سلوک کے واقعات اور حالات اور جو ان پر واردا تیں ہوتی تھیں۔ یا اُن کی حالتوں میں جو تغیرات نمودار ہوتے تھے درج ہوتے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کی تربیت بذریعہ خطوط ہوتی ہے۔ اُنکی ہر حالت کو سمجھنا اُن کے ہر سوال کا جواب دینا۔ ہر وادات کی صحیح قواعد کے مطابق تعبیر کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ دیکھئے اگر طبیب نے مرض کو نہیں سمجھا اور اگر سمجھا بھی مگر طبیعت کی قوت و ضعف کا لحاظ نہیں کیا۔ مکان یا ملک کے خصوصیات آب و ہوا کے اثرات کا خیال نہیں کیا۔ اگرچہ نسخہ قواعد کے موافق تجویز کر دیا بتلائیے مریض ہلاک ہوگا یا اچھا ہو جائے گا۔ یہی حالت بعینہٖ سالک اور شیخ کی ہے اول تو شیخ کو اُن کے حالات سمجھنا ضرور ہیں اور اُن کے مرض کی صحیح تشخیص لازمی۔ پھر اُن کے طبائع اور تمام لوازمات کا لحاظ لابدی اس کے بعد مجرب اور قواعد کے موافق علاج و تدبیر اختیار کرتا ہے۔ اور پھر ضروری پرہیز بھی بتلاتا ہے۔ جس سے صحت روحانی حاصل ہوتی ہے ورنہ اس کا نتیجہ یقینی طور پر بربادی اور ہلاکت ہے (اعاذنا اللہ منہ) ایسے خطوط کا جواب بہت ہی تدبیر کا محتاج ہے۔ مگر ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء حضرت حکیم الامت مدظلہ اس مشغولی میں بھی وہ وہ مجرب علاج تجویز فرماتے ہیں کہ اُسی شخص کا دل جانتا ہے۔ جس کو اس قسم کی تربیت سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ ایک طرف تو مخلوق کا ہجوم اور ہر شخص کے سوالات اور جوابات کا سننا۔ اُدھر تحریر میں مشغول رہنا اور کسی کی بات کو تشنہ نہ چھوڑنا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ایک دو خطوط کا جواب ادا کر دیا۔ باقی کل پر چھوڑ دیئے۔ نہیں ہر خط کا جواب آج ہی مکمل حتے کہ اکثر چالیس پچاس خطوط کا جواب مغرب تک ختم کر دیا جاتا تھا۔ یہ ایک دن کی حالت نہیں روزانہ اسی طرح ہوتا تھا۔ یہ حالت تو سفر کی ہے۔ لیکن حضر میں ایسا نہیں ہوتا تختہ انضباط

اوقات دیوار سے لٹک رہا ہے۔ کبھی اس کے خلاف نہیں فرماتے۔ ہر کام اپنے مقررہ وقت پر انجام پاتا ہے۔ وما ہذا الا بتوفیق اللہ۔ حضرت کے پاس مریدین اور سالکین کی تربیت کا سب سے پہلا اور ضروری جزو یہ ہے۔ کہ دینی اور دنیاوی اخلاق و آداب سیکھیں۔ اور اخلاق رذیلہ سے سبکدوش ہوتے رہیں۔ اور خاصکر ان امور میں جس میں کسی دوسرے انسان کو تکلیف ہو۔ نہایت شدت اور سختی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ اور الشریعۃ کلہا آداب۔ اور بعثت میسرا لا معسرا و لا متعنتا۔ اس بارہ میں اس قدر اہتمام ہوتا ہے۔ بعض موفق سالکین ہر روز یا ہر ہفتہ میں ایک نقشہ کی خانہ پُری کر کے بھیجتے ہیں کہ کس قدر اخلاق رذیلہ ترک ہوئے۔ اور اس کی جگہ کس قدر اخلاق کریمہ اختیار کئے گئے۔ چنانچہ مجھے اس قسم کے نقشوں کا علم بھی ہے (زادہم اللہ توفیقاً) کہ بہت سے رذائل کے خانے معرا تھے۔ اور وہ بھی ایسے جو کثیر الوقوع ہیں میں نہ کسی تنبیہ کی ضرورت نہ سامان اور تیاری کی حاجت بیٹھے بیٹھے بین یدیہ وجلیسہ انسان اس کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ مثلاً غیبت کسی کی یا کسی پر طنز و تعریض وغیرہ۔ (الحمد للہ علی ذلک ووفقنا اللہ لذلک) آپ کی تربیت و تعلیم محض سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ جس طرح حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم صرف صحبت و مکالمات و مفاوضات میں صحابہ کو فیض پہونچایا کرتے تھے۔ بعینہ ویسا ہی آپ کے یہاں ہوتا ہے۔ عام مشائخ کی طرح نہ مروجہ طریقہ پر حلقہ ذکر ہے نہ توجہ ہے۔ نہ کوئی ایسی صورت ہے کہ جس سے عام حالات سے کوئی امتیازی ہیئت پیدا ہو۔ بلکہ مجلس صحبت گرم ہوتی ہے اُس میں ہر طرح کی باتیں ہوتی رہتی ہیں اسی میں توجہ اسی میں القاء نسبت اسی میں فیض باظاہری صورت تو غیر ممتاز۔ مگر قلب خاص امتیاز کے ساتھ جملہ قلوب حاضرہ کا متجسس ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اُس کے ظرف کے موافق فیضان ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب مجلس سے اُٹھتے ہیں تو ہر شخص اپنی بساط کے موافق مالا مال جاتا ہے۔ میرا یہ مقصود نہیں کہ مروجہ حلقات مشائخ۔ یا

اُن کے طرق تعلیم معاذ اللہ ناجائز ہیں اس لئے کہ ہر شیخ فن سلوک میں مجتہد ہوتا ہے اگر وہ کسی مسئلہ میں خطا بھی کر جائے۔ تب بھی وہ ائمہ شرائع کی طرح مستحق ایک اجر کا ہے بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ حضرت حکیم الامۃ کی یہ امتیازی شان ہے کہ حتی المقدور اتباع سنت کو ہاتھ سے نہیں دیتے اور سنت کی محبت میں اپنے اجتہاد کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ یہ ایک سنت تھی کہ ایک زمانہ سے مردہ ہو چکی تھی۔ مشائخ قدمار ضوان اللہ علیہم اجمعین نے تو خاص بیماروں کے لئے خاص وقت پر یہ طریقے اختیار کئے تھے مگر اس کے بعد وہ سلاسل کے لئے شعار اور طور امتیاز کے سمجھے گئے۔ اور بلا امتیاز حالت مریض ہر ایک کو ایک ہی نسخہ استعمال کرایا جانے لگا۔ الا ماشاء اللہ اس سنت مردہ کے زندہ کرنے کا شرف صرف آپ ہی کو حاصل ہوا۔ اسی واسطے آپ کے حق میں میری شہادت ہے کہ آپ اس زمانہ کے مجدد برحق ہیں۔ یہاں موقع نہیں ورنہ میں تفصیل سے سنن کا ذکر کرتا جو مردہ ہو چکی تھیں۔ بلکہ نسیا منسیا ہو گئی تھیں۔ جس کی آپ نے تجدید کی اور زندہ فرمایا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کی مجددیت کی گواہی سب سے پہلے حضرت مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی نے دی تھی اور اس کے ساتھ آپ کا ادعاء بھی شامل تھا۔ اور وہ ادعا کے لئے مامور تھے۔ یہاں میں اپنے علم کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی مجددیت کی شہادت سب سے پہلے میں دیتا ہوں۔ یا کم سے کم تحریری شہادت گو بعد میں بلا کسی اعلان و اہتمام کے خود بخود صدہا بندگان خدا کے قلم سے یہ لقب لکھا جانے لگا۔ اور ممکن ہے کہ کسی کے قلم سے مجھ سے بھی پہلے[ع] نکلا ہو۔ مگر فرق صرف اس قدر ہے کہ میں بہ نسبت مولانا عبد الحکیم کے ایک ذرہ بے مقدار اور اُن کی جوتی کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔ وہ شہباز علم و عمل تھے لیکن خدا سے مجھے امید ہے کہ میری یہ شہادت بے وقعت نہ ہوگی۔ وہاں

ع کچھ یاد پڑتا ہے کہ مولوی محمد بیگ صاحب دہلوی نے غالباً اس کے قبل لکھا تھا مگر ماتن صاحب نے اپنے علم کے اعتبار سے صحیح فرمایا۔ ۱۲۔

دعویٰ بالمامور یت تھا۔ یہاں دعویٰ نہیں۔ وہاں خود حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ نے ان سنن کو گنوایا ہے جنکو آپ نے زندہ فرمایا تھا۔ یہاں سکوت ہے دوسرا گنوا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اصحاب بصیرت سے ہرگز مخفی نہیں رہ سکتا۔ کہ حضرت حکیم الامۃ کی تعلیم جناب مجدد صاحب رحمہ اللہ کی تعلیم سے بالکل اشبہ ہے اور دونوں کی رفتار ذہن بھی بالکل یک ساں ہے جس شخص کو اعتماد نہ ہو وہ حضرت مجدد صاحب صاحب کے مکتوبات اور حضرت کے مواعظ اور تربیت السالک کے اجزاء مقابلہ میں رکھکر دیکھے۔ ہاں فرق اس قدر پائے گا۔ کہ وہاں اصطلاحات نقشبندیہ میں مطالب اور مقاصد ادا ہوتے ہیں۔ یہاں اصطلاحات کی پابندی نہیں کی جاتی۔ بلکہ جس طرح کوئی سمجھ سکے سمجھا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک مردہ سنت تھی جس کو زندہ کیا گیا ہے ونیز حضرت مجدد صاحب کو اپنی مجددیت کا منجانب اللہ علم کرایا گیا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ حضرت پیر و مرشد کو بھی اپنی مجددیت کا علم ہے یا نہیں۔ کیونکہ مجددیت کے لئے لازم نہیں کہ صاحب مجددیت کو بھی اس کا علم ہو۔ اور اس تفاوت سے تفاضل یا توازن مقصود نہیں بلکہ واقعات کا اظہار ہے باقی الفضل للمتقدم کا کس کو انکار ہے۔ اسیطرح مجلس کی ہیئت کذائی میں بھی سنت کا لحاظ رہتا ہے بلکہ مردہ ہونے میں کوئی شک نہیں جسطرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل صحابہ اور اہل رائے کو اپنے نزدیک یا کسی نو وارد مہمان کو تواضعاً کوئی خاص نشست عطا فرماتے تھے۔ اور مدارج کا لحاظ رہتا تھا۔ اسیطرح حضرت حکیم الامت کی مجلس مقدس میں بھی ہوتا ہے۔ کوئی شخص اس کے خلاف حرکت نہیں کرسکتا۔ یہ دعوتوں کا سلسلہ جب شروع ہوا تو اُس میں بھی اچھا سنت تھا۔ صاحب دعوت پہلے صاف فرما دیتے کہ ایک میں اور میری ساتھ ایک خادم ہوگا۔ باقی رفقاء میں سے ہر شخص اپنے کھانے کا متکفل ہے۔ میرے ساتھ بلا تمیز مدعو و غیر مدعو کا جھگڑا نہیں ہوا کرتا۔ صاحب دعوت کا اختیار ہوتا چاہئے۔ دوسرے کسیکو دعوت دے یا نہ دے اور اگر دے تو صرف اپنے تعلقات اور تعارف کی بناء پر دے۔ حضرت کی وجاہت کو اس میں ہرگز دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ تو

فرماتے ہیں کہ کھائیں دوسرے اور صاحب دعوت کا احسان مجھ پر کیوں۔ کھانے کے بارہ میں فرمادیتے کہ اگر ایک ہی کھانا ہو تو بہتر ہے۔ الوان نہ ہوں معدہ پر بُرا اثر پڑتا ہے یہ بھی غالباً محض اتباع سنت کے خیال سے فرماتے تھے۔ جس کی تعبیر اخفاءً فرمادیتے تھے۔ اسی طرح حضور اپنے رفقاء سے فرمادیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے بل بوتے پر سفر کرے۔ اپنی تمام ضروریات کا انتظام ہر شخص بازار سے کرلے الا اس صورت میں کہ کوئی صاحب بہ یقین و تخصیص اسماء اسمائے کسیکو دعوت دے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کو تکلیف ہو۔ یہ بھی اس سنت کا اتباع ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طفیلی کو دروازہ صاحب دعوت پر سے واپس فرمادیا تھا۔ تحقیقت میں یہ وہ اخلاق ہیں کہ باوجود جدید تہذیبوں اور علمی ترقیوں کے کسی نے اس کے خلاف پر فتویٰ نہیں دیا۔ کس قدر بے غیرتی اور بے حمیتی ہے کہ کھلانے والا تو راضی نہیں دل میں کڑھ رہا ہے مگر پیر صاحب ہیں کہ لشکر لیکر پہونچے ہیں اچھی خاصی چڑھائی ہے۔ بلکہ پورے طور پر ڈکیتی کی تعریف صادق آتی ہے۔ اس ڈکیتی کو حدیث شریف میں یوں بیان فرمایا گیا ہے کہ جو بلا دعوت کسی کے گھر کھانے کے لئے جاتا ہے سارق ہو کر داخل ہوتا ہے۔ اور جب کھا کر نکلتا ہے مغیر یعنے غاصب اور لٹیرا ہو کر نکلتا ہے۔ یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ جہاں پیر صاحب دورہ پر نکلے بہت سے طفیلی جو ہمیشہ اسی قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں بو پر پہونچ جاتے ہیں یہاں سے ایک وہاں سے ایک غرض ایک لشکر جمع ہو گیا۔ پیر صاحب نے یہ سمجھا۔ او نہہ میرا کیا بگڑتا ہے رہنے دو حشمت و شوکت میں اور اضافہ ہوا۔ یہ فوج یاجوج ماجوج کی طرح جس گھر پر پہونچی اُسے تباہ کر دیا۔ اگر کسیکو علم قبل از قبل ہو گیا۔ اور صاحب مقدور بھی ہے۔ اُس نے تو انتظام پہلے ہی سے کرلیا ورنہ بے چاری کی بُری گت عین وقت پر بازار سے منگانا پڑتا ہے اگر وہ بھی میسر نہیں تو پھٹیان فقرے سننے پڑے۔ غرض بے چارے کی بُری حالت ہوئی دیوالہ نکل گیا دوبارہ توبہ کرلی پیر صاحب کی ناراضی کا خوف ہوا تو کچھ نقد لاکر منتے مارا۔ چلو جان بخشی ہو گئی۔ یہ تو ایک شخص کا مالی نقصان تھا۔

اور پیر صاحب کی گردن پر گناہ رہا۔ مگر ایک دینی نقصان یہ ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ پیر صاحب کو گھر لیجا کر تبرک حاصل کریں اور عورتوں کو بھی کچھ فائدہ پہونچے مگر غریب ہیں وہ اس حالت کو دیکھکر عبرت لیتے ہیں اور ڈر کے مارے پیر صاحب کی دعوت نہیں کرتے بلاتے نہیں جس کی وجہ سے وہ فیض سے محروم رہتے ہیں۔ مگر حضرت مجدد الملۃ دام فیضہ بالکل اس کے خلاف ہیں۔ بغیر تعیین کے قدم نہیں اُٹھاتے۔ چنانچہ مولٰسنا عبد الحی صاحب ابقاہ اللہ کو بھی یہی اطلاع دی گئی تھی کہ صرف دو آدمیوں کا کرایہ اور کھانا آپ کے ذمہ ہے یعنی خود سمیت باقی رفقا اپنے اخراجات کے خود متکفل ہوں گے۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف نے حضرت کے واسطے دوسرے درجہ کا کرایہ اور ایک خادم کے لئے تیسرے درجہ کا اور ضروری سفر خرچ بھیجدیا۔ مگر حضور تیسرے درجہ میں تشریف لائے۔ اور بقیہ کرایہ حساب کر کے واپس فرما دیا۔ اس خادم نے عرض کیا واپسی کے بعد ایک ہی مرتبہ حساب کر کے واپس فرما سکتے ہیں۔ دو مرتبہ حساب کرنے کی کیا ضرورت ہے فرمایا بھائی میں قلب کو کسی شغل میں اُلجھا ہوا رکھنا نہیں چاہتا۔ جو کام سامنے آیا کر دیا دل فارغ ہو گیا۔ دماغ کو بھی یکسوئی حاصل ہو گئی۔ ورنہ دل ادھر ہی معلق رہتا ہے۔ واپسی کا حساب واپسی کے وقت ہو جائے گا۔ اب تو فارغ ہو جاؤں۔ چنانچہ واپس ہونے کے بعد حساب کر کے بقیہ فوراً بذریعہ منی آرڈر مولوی صاحب موصوف کے پاس بھیجدیا۔ ہمیشہ آپ کی عادت مبارک ہی کہ دل کو کسی چیز سے معلق نہیں رکھتے۔ چنانچہ اگر کسی نے منی آرڈر کیا اور کوئی تفصیل کوپن میں نہیں لکھی تو آپ فوراً واپس کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کسے کیا پڑی کہ خط کا انتظار کرتا رہے اور بلا ضرورت دل میں ایک فکر پیدا کرے۔ اسیطرح آپ اُس شخص سے کوئی ہدیہ یا نذر قبول نہیں فرماتے۔ جس کی نسبت آپ کو علم ہو جائے کہ اس نے ایک معمول مقرر کر لیا ہے۔ کیونکہ بعض اوقات محض التزام کی بنا پر پیش کرتا ہے اُس میں خلوص نہیں ہوتا۔ پھر ہدیہ اور نذر لینے میں بھی خاص ضوابط ہیں۔ مثلاً

کوئی معمولی آمدنی والا اگر کچھ نذر کرے تو اس کی ایک دن کی پیداوار سے زائد نہ ہو اور اس شخص سے تعلقات اور ملاقات میں بے تکلفی بھی ہو گئی ہو۔ جس کی نسبت یہ وہم بھی نہ ہو سکے کہ اس کو کوئی گرانی ہوگی۔ وہ بھی ہمیشہ نہیں بلکہ گاہے گاہے۔ چنانچہ حیدرآباد میں بعض لوگوں نے نذریں پیش کیں۔ جو ان ضوابط کے دائرہ سے باہر تھیں آپ نے قبول نہیں فرمائیں، مزاحاً فرماتے ہیں۔ اس قدر کسی بے تکلف دوست سے قبول فرمالینا جس سے اُس کو تکلیف نہ ہو ہمارا حق ہے۔ کیونکہ ہم نے ترددِ معاش ترک کرکے اُن کی اصلاح کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس معاملہ میں حضور کی قناعت اور استغناء اتنا بلند ہے کہ اس میں شک نہیں رہتا کہ آپ کی صریح کرامت ہے۔ کئی ایک خدام و عقیدتمند و صاحب ثروت موجود ہیں مگر آپ نے ان سے اس قدر کبھی نہیں لیا کہ کسی نصاب کی حد تک پہونچے الا نادراً۔ نواب ڈھاکہ نے ایک مرتبہ باصرار حضرت کی دعوت کی اور چونکہ اُن کو معلوم تھا اس لئے بلطائف الحیل کچھ سامان اور نقد نذر کرنے کی اجازت چاہی۔ اور یہ کہا کہ ایسے موقع پر نہ لینے میں ہماری سُبکی ہے۔ آپ نے جواب دیا بہت اچھا لوگوں کے سامنے تو قبول کرلوں گا مگر خلوت میں واپس کردوں گا۔ کیونکہ بھری مجلس میں نہ دینا آپ کے طرز کے خلاف ہے اور میرا انکار کرنا آپ کی توہین۔ اور قبول کرنا میری توہین ہے میں اس وقت اپنی توہین گوارا کرکے لے لوں گا۔ پھر رکھنا رویہ کے خلاف ہے لہذا واپس۔ نواب صاحب کو دم مارنے کی جگہ نہ تھی۔ اور اُلٹے شرمندہ ہوئے۔ فرمایا آجتک جس قدر مشائخ میرے پاس آئے۔ میری دنیا بھی لے گئے اور دین بھی۔ جناب کے ولیسا میں نے کسیکو نہیں پایا۔ اس گفتگو میں حضور میری طرف مخاطب ہوئے۔ اور ارشاد فرمایا کہ سفر خرچ اور کرایہ سے جو نواب صاحب نے دیا تھا تقریباً بیس روپیہ بچ گئے تھے۔ میرے قاعدے کی رو سے تو واپس کرنا چاہئے تھا مگر میں نے سمجھا اس حقیر رقم کی واپسی میں نواب صاحب کو رنج ہوگا۔ اس کے علاوہ اُن کو اس کی پرواہی کیا۔ محض اُن کی توہین

کے خیال سے میں نے وہ رقم مسجد کے ایک سائبان میں خرچ کرلی۔ مگر اُن کو اطلاع کردی۔ یہ تمام وہ سنن ہیں جو آجکل مردہ ہوچکی تھیں۔ جنکا احیاء آپ نے فرمایا۔ پھر اس قناعت پر بھی یہ حالت ہے کہ خانقاہ سالکین فقراء سے معمور ہے ایک ابتدائی تعلیم کا مدرسہ بھی جاری ہے۔ جب سے ہندوؤں نے سدھی کا فساد ایجاد کیا۔ ایک شعبۂ تبلیغ بھی ہمیشہ کے لئے جاری فرمادیا جس میں بہت ہی متقی صاحب نسبت علماء کام کرتے ہیں۔ اس پر بھی احتیاط کا یہ عالم کہ کانپور میں ایک دولت مند طبیب نے انتقال کے قریب اپنی دو تین ہزار آمدنی کی جائداد مولانا کے نام ہبہ بالوصیت فرمائی۔ آپ خود کانپور میں تشریف لے گئے اور اُس جائداد کو یتیم خانہ اسلامی پر وقف فرمادیا۔ اور باضابطہ وقف نامہ مکمل کردیا۔ اس میں کچھ حصہ اپنے لئے نہ اپنے مدرسہ اور خانقاہ کے لئے اور نہ تعلق اپنی ذات سے باقی رکھا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اسیطرح بیعت کے وقت بھی کسی سے نذر قبول نہیں فرماتے۔ نہ مُرمُرے نہ بتاشے نہ کسی شیرینی وغیرہ کی تقسیم کی اجازت دیتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو یہ طرز سنت نبوی کے خلاف۔ دوسرے غرباء اور مفلس بیعت سے محروم رہتے ہیں نہ اُن کو نذرانہ کی قدرت نہ تقسیم شیرینی کی وسعت۔ ہاں دوسرے وقت میں اگر کوئی بے تکلف ہو جاوے۔ یا پرانے تعلقات والا ہو۔ قبول ہدیہ میں مضائقہ نہیں فرماتے۔ مگر وہ بھی ایسے طور پر نہیں جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ یہ تو بغیر نذر کے توجہ ہی نہیں کرتے۔ پھر اس میں بھی یہ شبہ رہتا ہے کہ حرام یا مشتبہ آمدنی سے نہ ہو۔ مگر اسی حد تک جسکا علم ہوجاوے یا وہ شخص مشتبہ یا حرام آمدنی کے پیشہ میں خود مشہور ہو۔ اُس سے زیادہ تجسس نہیں فرماتے۔ کیونکہ شریعت میں وہ بھی ممنوع ہے۔ چنانچہ دو معزز عہدہ داران حیدر آباد نے آپ کی دعوت کی۔ آپ کو یہ علم ہوگیا کہ اُن کی تنخواہ کے مدات قواعد شرعیہ پر منطبق نہیں ہیں۔ آپ نے رد دعوت تو نہیں فرمایا۔ البتہ ان سے مخلصانہ طور پر کہدیا گیا۔ کہ مہربانی کرکے قرض لیکر دعوت کا کھانا پکائیے۔ چنانچہ

سنجیدہ اور ذی فہم لوگ تھے۔ نہایت خوشی سے اُنھوں نے قبول کرلیا۔ بیعت بھی ہر شخص کو نہیں کرتے پہلے اُس کو ذکر و شغل میں لگادیتے ہیں۔ اور وہ اپنے حالات کی اطلاع دیتا رہتا ہے۔ اس کے بعد اگر اُس نے درخواست کی اور اس میں رشد کے آثار ملاحظہ فرمائے تو بیعت فرمالیتے ہیں۔ ورنہ نہیں فرماتے ہیں مجھے اپنے جتھہ کے بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ کام کرنے والے چاہئیں۔ یہ تو حضرت کی حالت ہے سفر میں تو سوائے مستورات اور مریضوں کے کسی کو بیعت نہیں فرماتے۔ اس زمانہ قیام حیدرآباد میں بیسیوں لوگوں نے بیعت کی درخواست کی۔۔۔۔۔ مگر آپ نے انکار فرمادیا۔ اور نہایت شفقت سے فرمایا کہ سفر میں میں بیعت نہیں کرتا۔ کیونکہ سفر میں میں بھی مہذب بنا رہتا ہوں۔ اور جو صاحب میرے پاس تشریف لاتے ہیں وہ بھی مہذب ہو کر ملتے ہیں۔ کسی کی اصلیت کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ آپ آکر میرے پاس تھانہ بھون میں رہیں۔ میرے اندرونی بیرونی حالات آپ کو پوست کندہ معلوم ہو جائیں۔ میری عام معاشرت کا آپ کو علم ہو جائے۔ اور مجھے بھی آپ کے اخلاق۔ استعداد۔ عادات اور پورے حالات کا علم ہو جائے گا۔ اس حالت میں اگر فریقین کی رضامندی ہوئی تو بیعت بھی ہو جائے گی اور کچھ تصوف اور سلوک کا دارومدار بیعت پر نہیں۔ وہ تو کام کرنے پر اور شیخ کی اطاعت پر ہے۔ جیسا شیخ کہے بلاچون و چرا اُس کا حکم تسلیم کرے۔ ہاں اگر صاحب خبرت ہے اور شیخ کا حکم صریح شریعت کے خلاف ہے تو کبھی اطاعت نہ کرے۔ مگر گستاخی نہ کرے۔ ادب سے عذر کردے وہ بھی جب کہ شیخ صاحب کمال ہو ورنہ ایسے شیخ ہی کو خیرباد کہے۔ ۶۔ یز و واقع میں حضرت حکیم الامت مجدد الملت کا فرمان عین شریعت کے مطابق ہے۔ یہ بھی کوئی دینداری اور دیانت ہے کہ اپنی شوکت و عظمت بڑھانے کی غرض سے جو آیا اُسے پھانس لیا جائے جو عمل کرے پیر صاحب ضامن ہیں۔ فقط بیعت کی اور ایک پرچۂ نجات ہاتھ میں پکڑا دیا جب کبھی پیر صاحب تشریف لائے تو جلو میں

مریدوں کا ایک جمِ غفیر ساتھ ساتھ ہے۔ پیر صاحب ہیں کہ شہر بشہر در بدر مریدوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جو ملا پیر صاحب نے اپنے جال میں پھانس لیا۔ ۱۰ر ربیع الثانی ۲۶ھ کو میں حیدر آباد سے سکندر آباد آ رہا تھا۔ ایک نوجوان شخص میرے درجہ میں سوار تھا۔ خدا جانے اُس کو کیا سوجھی کہ اُس نے میرے سامنے اپنی بیوی کی بے اعتنائی۔ اور اپنے سسرال والوں کی روک رکھنے کی شکایت کی اور رونے لگا۔ اُس نے اپنی بے تابی اور بیوی کے ساتھ عشق و محبت کے واقعات بھی بیان کیے۔ اور مجھ سے طالب دعا ہوا۔ مجھے بھی اُس کے بیان سے بہت ہی دل میں رقت ہوئی میں نے اُس کو تسلی دلاسا دیا کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ پھر ملاپ ہو جاویگا۔ اس اثنا میں اُس نے بیان کیا کہ اسی غرض سے حضرت۔۔۔ شاہ صاحب جو آجکل حیدر آباد میں آئے ہوئے ہیں اُن سے بیعت بھی ہو گیا کہ شاید کوئی عمل بتائیں اور میں اس دردِ جدائی سے نجات پاؤں۔ مجھے یہ واقعہ سنکر سخت تعجب ہوا۔ کہ اللہ اللہ مشائخ کی یہ شان اور یہ ارشاد باقی رہ گیا ہے۔ اور اس نعمت بیعت کو اس قدر بے وقعت کر دیا گیا ہے۔ پیر صاحب کا کام نہ ضامن ہونے کا ہے نہ جورو دلانے کا ہے۔ اُس کا کام صرف صحیح راستہ بتانا اور پرحذر مواقع سے مرید کو متنبہ کرنا ہے عمل کرنا مرید کا کام ہے۔ اور ثمرہ کا ترتب خدا کا کام ہے۔ اگر مرید کی غرض صحیح نہیں اور پیر کو بیعت کر کے دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ اور دھوکا ہو بھی گیا۔ اس میں صرف مرید ہی قابل اعتراض نہیں بلکہ پیر بھی قابل مواخذہ ہے۔ کیونکہ حزم و احتیاط پیر کا فرض تھا۔ ہاں حزم و احتیاط کے بعد بھی اس قسم کا دھوکا ہو جائے۔ تو پیر ہر قسم کی تشنیع اور شماتت سے بری ہے اس لئے کہ وہ غیب دان نہیں۔ اور نہ غیب دانی کا وہ شرعاً مکلف ہے۔ اور نہ کشف والہام اختیاری ہے۔ یہی سنت ہے انبیاء علیہم وعلی نبینا الصلوٰۃ والتسلیمات ہر نبی کے ساتھ ہمیشہ ایک گروہ منافقین کا

ہوگا۔ اور ہر نبی پر ظاہر کے اعتبارات کا لحاظ فرض تھا استعلام باطن کے وہ مکلف نہ تھے۔ بہت سے منافقین سے اُن کو ایک عرصہ تک نہ ہوتا تھا۔ وہ معذور تھے۔ رہی یہ بات کہ یہ عذر ہر شیخ پیش کر سکتا ہے۔ کہ باوجود احتیاط کے بھی مریدوں کے ضمائر ان سے مخفی رہے۔ مگر میں بھی کہتا ہوں کہ یہ جواب صحیح ہے اگر قرائن و آثار اس کی تصدیق کریں۔ ؏۵ یہ نہیں کہ اُدہر سے مرید نے شیخ کی صورت دیکھی اودہر شیخ نے مرید کی اور دس منٹ میں بتراضی طرفین عقد مرتب ہو گیا۔ بعض اوقات تو اس کی بھی نوبت نہیں آتی۔ پیر نے چادر پھینکی اور ایک فوج نے اُسے چھو لیا پیر صاحب مرید کی صورت اور نام سے بھی آگاہ نہیں۔ ایسی بیعت سے کوئی نتیجہ نہیں۔ سلسلہ میں شریک ہونے سے برکت بھی اُسی وقت حاصل ہوتی ہے کہ مرید بھی مقتضاء بیعت پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہو اگرچہ قصور و تقصیر واقع ہو جائے۔ نہ یہ کہ بیعت کو ذریعہ نجات سمجھکر اعمال عادیہ بھی ترک کرے ایسی بیعت شرعًا بالکل ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ وہ اتکال منہی عنہ ہے اس سے اجتناب فرض ہے۔ ورنہ مرید تو ڈوبے ہی تھے پیر صاحب بھی پاتال پہونچ گئے اور مفسدین کی فہرست میں نام لکھا گیا۔ جس کی قرآن شریف میں صاف ممانعت ہے۔ (وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ) اور یہ شرعی قاعدہ ہے۔ کہ اگر کوئی امر مطلوب شرعی نہیں اور درجہ استحباب میں ہے اور اُس کے استعمال سے مفسدہ پیدا ہوتا ہے۔ تو اُس کا ترک کر دینا فرض ہے۔ اور اگر مطلوب شرعی ہے تو مفسدہ کی اصلاح فرض ہے۔ میں خود کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ ناظرین کرام خود اس قسم کی بیعت کو اس معیار پر جانچ لیں۔ میرے خیال میں مرید ہونے والوں میں سے جو بلا جانچ پڑتال جھٹ منگنی پٹ نکاح بیعت ہو جاتے ہیں۔

؏۵ پھر غور سے دیکھا جاوے تو یہ قیاس مع الفارق ہے تعلیم اسلام فرض ہے اُسکے لئے کاوش نہ چاہئے بیعت فرض کیا کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں۔ اس میں کاوش ضروری ہے۔ ۱۲

اور پیر بھی جانچ نہیں کرتے۔ فی صدی دس بھی ایسے نہیں نکلیں گے جو بیعت کی غرض و غایت اپنی دینی اصلاح اور تزود آخرت سمجھتے ہوں۔ و نیز اس قسم کی بیعت کرنے والے پیر فیصد ایک بھی اس غرض و غایت کا نہیں ملے گا۔ اس کی تو واحد غرض حب جاہ و مال ہے۔ اسی لئے جو سامنے آیا اُسے پھانسا۔ (اعاذنا اللہ منہم) بلکہ اکثر و بیشتر مریدوں کی یہ غرض ہوتی ہے۔ بیعت ہو کر بلا کسی عمل کے بلیات دنیا و عقبیٰ سے نجات پا جائیں جو مفسدہ فی الدین ہے اور سراسر انکال ممنوع ہے۔ اس قیام کے زمانہ میں وعظ کے لئے دعوتوں پر دعوتیں آنے لگیں مگر اکثر جگہ حضرت مجدد الملۃ نے انکار فرما دیا۔ اور جن دعوتوں سے انکار فرمایا اور جن وجوہ سے انکار فرمایا باوجود سابقہ واقفیت کے ہم لوگ بھی بے خبر تھے۔ اور آخر میں داعیین میں وہی وجوہ مانعہ پائے گئے۔ جنکی بنا پر انکار فرمایا گیا تھا۔ یہ آپ کا بین کشف یا وہ فراست کا حصہ تھا جو ایسے بزرگوں کو انبیاء سے ملا ہے۔ دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ میں کیا کروں میرا قلب ہی متوجہ نہیں ہوتا۔ حیدرآباد میں صرف تین جگہ وعظ فرمایا۔ اور ہر جگہ ایک ہی آیت شریفہ کی تلاوت فرمائی۔ مگر ہر جگہ مضامین اور مقاصد اور جہات مختلف تھے۔ ایک وعظ تو مولانا عبدالحی صاحب البقاہ اللہ کے زمانہ میں۔ دوسرا وعظ بتاریخ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۱۴ھ حضرت مولانا الحاج الحافظ محمد احمد صاحب مدظلہ مفتی عدالت عالیہ کی استدعا پر مدرسہ نظامیہ میں یہ وعظ رات کے وقت ہوا تھا۔ اور تقریباً پانچ گھنٹوں میں ختم ہوا۔ لوگ ابھی زیادتی کے متمنی تھے۔ اس وعظ میں شریعت کے لباس میں جو معارف اور لطائف بیان ہوئے اُس کے لکھنے سے قلم قاصر ہے ناظرین خود تھوڑی دیر میں ملاحظہ فرمالیں گے۔ پھر یہ نہیں عام رویہ کے ماتحت سامعین

عہ زیادہ تر مولوی صاحب کی اُن ہی اہلیہ صاحبہ کی تحریک پر جنہوں نے اس سفر کی درخواست کی تھی ۱۲

کی تفنن طبع کا لحاظ رکھا جائے۔ بلکہ وہ وعظ فرمایا جاتا ہے۔ جس کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں اسی قسم کے وعظ کی ضرورت تھی۔ حضرت کی یہ عادت مستمرہ ہے کہ مضامین میں سامعین کے مذاق کے پابند نہیں ہوتے اور نہ فرمایشی مضامین بیان فرماتے ہیں۔ علاوہ اور قبائح اور فتن کے جو اس سے پیدا ہو سکتے ہیں فرماتے ہیں یہ تو مریض کی فرمایش ہوئی۔ کہ طبیب صاحب اس کے واسطے فلاں نسخہ تجویز کریں۔ اسیطرح وقت مقرر کردہ کی پابندی نہیں فرماتے۔ اور جہاں کہیں وقت مقرر کیا جاتا ہے۔ وہاں وعظ ہی نہیں فرماتے۔ کیونکہ طبیب جس قدر وقت مناسب سمجھتا ہے۔ دوائی استعمال کرتا ہے مریض کی فرمائش خود مریض کی ہلاکت کا باعث ہے۔ ہاں یہ طبیب کا فریضہ ہے کہ مریض کو اتنی دیر تک دل برداشتہ نہ ہونے دے اور اگر وہ اُکتا جاتا ہے تو وہ تدابیر اختیار کرے۔ جس سے وہ نہ اُکتائے۔ اسیطرح اور واعظوں کی شرکت میں بھی وعظ نہیں فرماتے ہیں۔ مضامین اکثر مختلف ہو جاتے ہیں۔ واعظین سب ایک عقیدہ کے نہیں ہوتے۔ اکثر ردو تردید کی نوبت پہونچتی ہے جس سے بجائے اصلاح کے لوگوں کے خیالات اور زیادہ خراب ہوتے ہیں اور اہل علم کی بے وقعتی علحدہ۔ پھر بعض اوقات تو وہیں بڑے بڑے فساد ہو جاتے ہیں پولیس جاوڑی جانے کی نوبت آتی ہے۔ اور اس قسم کے وعظوں میں لوگوں کی دلچسپی صرف اس قدر ہوتی ہے کہ مختلف واعظوں کے نمونے اور بانگیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور پھر ہر ایک واعظ کی نقلیں اُتارتے ہیں من مانے مقابلے اور فقرے کستے ہیں۔ تیسرا وعظ مدرسہ انوار الاسلام نام پلی میں ۴ محرم الحرام ۱۳۴۲ھ کو ہوا تھا اور اس وعظ کو پہلے ہی بہت دقت سے قبول فرمایا تھا۔ اور وہ بھی چند مخلصین خدام کے اصرار سے۔ مگر اُس شام کو جس کی صبح میں وعظ ہونے والا تھا۔ ایک معتبر ذریعہ سے آپ کو علم ہوا کہ جمعہ کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے آپ کے متعلق کچھ کلمات ناشائستہ بیان کرکے لوگوں کو اشتعالک دی۔ اور منع کیا کہ وعظ میں نہ جائیں۔ اور یہ

ایک حد تک صحیح تھا۔ کیونکہ خود میں نے ..... صاحب کو دیکھا کہ نہایت غیظ و غضب کی نظریں حضرت مجدد الملۃ پر مکہ مسجد میں ڈال رہے ہیں۔ جبکہ حضرت کے مصافحہ کے لئے لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ ان کی نگاہوں سے وہ آگ جو اُن کے دل میں رشک اور حسد سے بھڑک رہی تھی ظاہر ہوتی تھی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر میرا وعظ باعث تفرقہ مسلمین ہو سکتا ہے تو میں ہرگز وعظ نہیں کہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو۔ ہمارے اسلاف نے اس سے بہت اجتناب فرمایا ہے۔ لہذا حذف کچھ وعظ فرض عین نہیں ہے۔ اور نہ میں حیدرآباد میں اس غرض سے آیا ہوں۔ رہا یہ امر کہ منتظمین وعظ پر طعن و تشنیع ہوگی۔ کیونکہ اشتہار تقسیم ہو چکے ہیں لوگ جمع ہوں گے۔ اس کا علاج یہ ہے۔ کہ ایک سمجھدار آدمی وہاں کھڑا ہو کر میری دوسطری عبارت لوگوں کو پڑھکر سُنادے۔ اور یہہ اس کاتب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ جس سے غرض یہ تھی کہ میں اس کام کو انجام دوں۔ میں نے امتثال کے لئے رضامندی ظاہر کی۔ فرمایا میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کی ناراضی اور اُن کے طعن و تشنیع کا بار داعیین کے سر ڈالا جائے میں اپنے سر لوں گا۔ اس کے بعد مخلصین نے داعیین اور دوسرے لوگوں کی مایوسی جو دیکھی تو بہت ہی دل میں تکلیف معلوم ہوئی۔ اس کے علاوہ حاضرین کے غیظ و غضب کی انتہا نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس وقت اُن کو ..... صاحب مل جائیں تو کچا ہی تو کھا جائیں۔ اور یہ بھی اندیشہ تھا۔ اور وہ بھی اندیشہ بجا تھا کہ بعض اشخاص نے قصد کر لیا تھا۔ کہ اس کو اس حرکت کی سزا دیں۔ اس لئے اس واقعہ کی ایک مخلص نے جو ..... کی گفتگو کے وقت موجود تھے تاویل کر کے ٹالا۔ تب کہیں صبح کو انوار الاسلام میں وعظ ہوا۔ وعظ کے وقت جیسا کہ مدرسہ نظامیہ میں ہزاروں لوگوں کا ہجوم تھا۔ اور جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ یہاں بھی وہی حالت تھی۔ باوجودیکہ سایہ کا انتظام کافی نہ تھا

اور شدت کی دہوپ تھی۔ مگر لوگ ہلتے تک نہ تھے۔ عوام کو تو چھوڑیئے بےچارے
اس قسم کی تکلیفوں کے عادی ہوا کرتے ہیں۔ قابل تعریف تو بڑے بڑے عہدہ دار
اور امرا ہیں جو وعظ میں شریک تھے ساری دہوپ اُن کے سر پر گئی مگر آفرین
ہے اُٹھنے کا نام تک نہیں لیا۔ برابر پانچ گھنٹے کے قریب جمے رہے۔ چنانچہ بہت
سے معتمدین اور نظما اور صدر المہامان شریک تھے۔ مگر کیا کرتے وعظ
اتنا دلچسپ اور اس قسم کے معارف اور نکات بیان ہو رہے تھے کہ اٹھنا کسے گوارا تھا
اٹھنا تو درکنار کروٹ لینا محال تھا۔ کأن علی رؤسہم الطیر جزاہم اللہ
خیر الجزاء۔ ان تینوں وعظوں کو لکھنے والے مولانا عبدالحلیم صاحب کانپوری
تھے۔ آپ بہت ہی تیز نویس ہیں۔ اکثر مواقع پر حضرت حکیم الامت کے
وعظوں کو قلمبند کیا ہے۔ آپ ذی استعداد و ذہین ہیں۔ آپ کا کانپور میں
چمڑے کا کارخانہ ہے۔ اور چمڑے کے سامان کی تجارت کرتے ہیں۔ آپ کا
اکثر حصہ عمر اور بالخصوص زمانہ طفولیت حیدرآباد میں گذرا ہے۔ آپ کے قریبی
عزیز و اقارب حیدرآباد میں سرکاری خدمات پر تھے۔ اب آپ کانپور میں
تشریف رکھتے ہیں۔ کئی مرتبہ حیدرآباد میں تاجرانہ حیثیت سے تشریف لائے
ہیں آپ اپنی عقیدتمندی سے حضرت کے مواعظ ضرورت کے وقت بجنسہ تقریر
قلمبند فرما لیتے ہیں عہ۔ اب میں ناظرین سے رخصت ہوتا ہوں اور اسکے بعد وعظ دیکھیے

عہ اگر کوئی وعظ کسی کا ضبط کیا ہوا بدون نظر اصلاحی صاحب وعظ کے شائع نہیں ہوتا۱۲

عہ یہ تین وعظ ہیں۔ جیسا اوپر مذکور ہوا۔ ان میں سے مدت ہوئی ایک
مستقل چھپ چکا ہے۔ العبادہ۔ اور دو اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ آثار
العبادہ و اسرار العبادہ خیال یہ
تھا کہ تینوں ساتھ شائع ہوں
مگر اتفاقات نے مجبور کردیا۱۲

کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ دعا ہے کہ اپنے موہبات سے وہ ارحم الراحمین ہمکو اس وعظ سے استمرارًا مستفید فرمائے۔ اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے آمین وہوالموفق والمستعان

فقط

حررہ احقر نور محمد فاروقی عفا عنہ صدر مدرس مدرسہ دینیات

اصطبل عامرہ سرکار عالی حیدر آباد دکن خلدہ اللہ ملکہ

بتاریخ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۲ھ

بوقت ۹½ بجے شب

سلسلۃ التبلیغ کے مختصر مواعظ		قیمت			قیمت
ذکرالرسول۔	پہلا وعظ	۲ر	ملت ابراہیم۔	تینتیسواں و	
شکرالنعمۃ ۔ . . .	تیسرا وعظ	۳ر	والعبادہ	چونتیسواں وعظ	۵ر
الظاہر . .	چوتھا وعظ	۴ر	حرمات الحدود۔	پینتیسواں وعظ	۵ر
التعمیم لتعلیم القرآن الکریم	گیارہواں وعظ	۲ر	البدائع والمغفرہ۔	چھتیسواں وعظ	۴ر
دعوۃ الی اللہ۔	اٹھارہواں وعظ	۳ر	ذم النسیان۔	سینتیسواں وعظ	۴ر
ایوار الیتامٰی۔	تیسواں وعظ	۳ر	العبرہ ۔	اڑتیسواں وعظ	۶ر
ترجیح الآخرہ۔	اکتیسواں وعظ	۳ر	الاسعاد	انتالیسواں وعظ	۵ر
الرفع والوضع۔	بتیسواں وعظ	۳ر	تقلیل الطعام۔	چالیسواں وعظ	۳ر
			تقلیل المنام۔	اکتالیسواں وعظ	۲ر

المشتہر

احقر محمد شبیر علی مدیر رسالہ النور تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو ایۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

چھیالیسواں وعظ

مسمّٰی بہ

آثار العبادہ

منجملہ ارشادات حکیم الامۃ حضرت مرشدی و مولائی مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم العالی

حسب فرمایش جناب ناظم صاحب ادام اللہ المواعظ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرفی المطابع تھانہ بھون کے اہتمام سے چھپا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ المسمّٰی بہ

آثار العبادة

این	کہاں ہوا	مدرسہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد دکن
متی	کب ہوا	۲۷ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ روز شنبہ بعد عشاء
کم	کتنی دیر ہوا	۲ گھنٹہ
کیف	ہیئت بیان	کرسی پر بیٹھکر
من ای شان	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	. . .
لم	سبب وعظ	. . .
ماذا	کیا مضمون تھا	. . .
من ضبط	کس نے لکھا	احمد عبد الحلیم کانپوری لیڈر ورکس مشن روڈ کانپور و حاجی محمد یوسف خان صاحب کی صرف سے احقر ظفر احمد عفا عنہ اسیر نے اور حیدرآباد کے دوسرے وعظ اسرار العبادة کے ساتھ کر دونوں وعظ [illegible]
المستمعون	سامعین کی تخمینی تعداد	۴۰۰
الاشتات	متفرقات	

دعاء۔ خطبہ ماثورہ۔ تعوذ و تسمیہ۔ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا۔ یہ ایک آیت ہے سورۂ مریم جس کی تلاوت اس کے قبل ایک نہایت مختصر جلسہ بیان میں کی گئی تھی چونکہ مضمون نہایت ضروری تھا اس لئے اسی کی شرح کو یہاں بھی کافی سمجھا گیا۔ اور اسی کی تلاوت بھی کی گئی۔ اور اس مضمون کا

خلاصہ آیت کے سننے ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ کسقدر ضروری مضمون ہے۔ اور ضرورت بھی ایسی ویسی معمولی نہیں بلکہ اس کا بڑا شدید درجہ ہے جس کے اعتبار سے اُس کو اہم کہہ سکتے ہیں۔ اور جو مقصود ہے آیت سے اُس کا مادہ خود آیت میں موجود ہے اس لئے مجھے اُس کے تعیین کی ضرورت نہیں۔ اور وہ مادہ کیا ہے وہ عبادۃ ہے جو فاعبدہ میں مذکور ہے اور اُس کا سیاق و سباق اسی کی تمہید کے لئے ہے یا تاکید کے لئے باقی مقصود صرف فاعبدہ ہے جس میں عبادت کا امر ہے جو عام طور پر اس کے سننے ہی سے مسلمانوں کے ذہنوں میں آگیا ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسیکو فاعبدہ کا صیغہ اور ترکیب نہ معلوم ہو مگر یہ تو سب ہی کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اس میں عبادت کا ذکر ہے۔ اور عبادت گو ایک شرعی اصطلاح ہے مگر خفی نہیں ہے۔ کون مسلمان ایسا ہے جو لفظ عبادت کا استعمال نہ کرتا ہو۔ متعدد موقعوں پر اسکا برابر استعمال کیا جاتا ہے اس لئے آیت کا مفہوم تو سب کے ذہنوں میں متعین ہوگیا ہوگا۔ کہ اس آیت میں عبادت کا امر ہے اور یہی اس کا خلاصہ ہے۔ جب مقصود کی تعیین ہوگئی تو اُس کا ضروری ہونا بھی معلوم ہوگیا۔ کیونکہ حق تعالیٰ اُس کا امر فرما رہے ہیں۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ عبادت کا مفہوم اس قدر تو سہل کہ روزمرہ کی بول چال میں آتا ہے۔ اور اس قدر ضروری کہ ہر وقت انسان اُس کا مکلف ہے مگر پھر کیوں اس کی طرف توجہ نہیں اور یہ ایک عجیب رحمت حق ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ عام ضرورت کی ہوتی ہے اُسیقدر زیادہ سہل ہوتی ہے۔ مگر غافلین کی بے قدری سے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ چیز جس قدر سہل ہوتی ہے اُسیقدر اُس کی وقعت گھٹتی جاتی ہے۔ حالانکہ سہولت واقع میں وقعت گھٹنے کا سبب نہیں بلکہ اور زیادہ توجہ کا سبب ہے کیونکہ سہولت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے طبائع و اذہان میں زیادہ مناسبت پیدا کردی گئی ہے اور مناسبت عامہ اُسی چیز سے پیدا کی جاتی ہے جو اہم ہو جو چیز جس قدر زیادہ اہم ہے اُتنا ہی زیادہ عام ہے یہ ایک قدرتی انتظام ہے اور یہ انتظام بھی عام ہے۔ تکوین کو بھی تشریع کو بھی۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لئے ہوا کی ہر وقت کس درجہ ضرورت ہے چنانچہ

سانس کی آمد و رفت ہی پر قوام عیش کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اگر سانس بند کر دی جاوے تو ہلاکت یقینی ہے اور اگر ہوا معدوم کر دی جاوے تو سانس بند ہونا یقینی ہے۔ غرض ہوا کا عناصر اربعہ میں ضرورت میں سب سے اشد ہے مگر باوجود اس کے کتنی ارزاں اور کس قدر عام ہے کہ ہر جگہ ہے اور مفت ہے کہ کہیں بھی نہیں بکتی گو اس کے آلات بکتے ہوں۔ مگر وہ آلات ہوا پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتے۔ صرف ساکن ہوا کو حرکت دینے کے لئے ہوتے ہیں۔ مثلاً پنکھا کہ اس کے ذریعہ سے ہوا میں حرکت پیدا کی جاتی ہے۔ جس سے راحت میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ مگر نفس راحت پنکھے پر منحصر نہیں وہ محض ہوا سے ہے۔ چنانچہ اگر پنکھا نہ ہو تو یہ اور بات ہے کہ گرمی کی تکلیف ہو مگر ہلاکت نہیں ہو سکتی بخلاف ہوا کے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان ہلاک ہی ہو جاوے۔

بہرحال ہوا چونکہ مدار زندگی ہے اس لئے قدرتی انتظام ہے کہ اُس کا ایک کرہ ہے جو جو میں بھرا ہوا ہے جس کی نہ قیمت نہ تخصیص بلکہ بے حد تعمیم ہے۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ جس قدر زیادہ ضرورت کی چیز ہو۔ اُسیقدر زیادہ مہنگی اور دشوار یاب ہو۔ مگر نہیں قدرتی انتظام بالکل اس کے برعکس ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ ضرورت کی ہے اُسیقدر زیادہ ارزاں ہے چنانچہ ہوا کی کیفیت آپ نے دیکھ لی۔ پھر ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ سو چونکہ اس کا درجہ ہوا سے کم تھا۔ اس لئے کہیں کہیں کبھی کبھی بکتا بھی ہے پھر دیکھئے سب میں کم کام آنیوالی چیز جواہرات اور موتی ہیں چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے شاید زندگی بھر بھی جواہرات دیکھے بھی نہ ہوں گے اور نہ استعمال کئے ہوں گے تو کسی کی ضرورت اس پر اٹکی نہیں۔ مگر باوجود اس کے دیکھ لیجئے کس قدر قیمتی ہیں اور جیسے تکوین میں آپ نے دیکھا کہ ضروری چیزیں ارزاں ہیں اور غیر ضروری گراں۔ یہی انتظام حق تعالیٰ نے تشریع میں بھی رکھا ہے۔ چنانچہ تشریع میں سب میں ضروری اور اہم اور سب سے بڑا ایمان ہے۔ کہ کوئی وقت اور کوئی حالت ایسی نہیں جس میں یہ ساقط ہو جاوے۔ اسلئے اس میں اسقدر تعمیم ہے کہ اگر زبان سے نہ ہو سکے تو قلب سے ہو۔ اور ایک دفعہ زبان و قلب سے ہو جانے کے بعد اگر

غفلت کی وجہ سے قلب میں دوام استحضار نہ ہو تو مضر نہیں بلکہ ایک دفعہ کا استحضار بھی کافی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اُس کی ضد کا استحضار نہ ہو۔ چنانچہ کوئی شخص ایک مرتبہ ایمان کا اعتقاد کر کے سو گیا یا کسی دوسرے شغل میں منہمک ہو گیا تو ظاہر ہے اس وقت اس کو ایمان کا استحضار نہیں۔ کیونکہ قاعدہ ہے النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد عادۃً اور عادۃً کی قید اس لئے لگائی کہ نفس کی توجہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف ہونے میں کوئی امتناع عقلی ثابت نہیں ہے بلکہ عقلاً ایسا ممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ توجہ تام نہ ہو غیر تام ہو مگر توجہ دو طرف ہو سکتی ہے۔ گو عادۃً ایسا کم ہوتا ہے اس لئے یہ قید بڑھائی۔ تو سو جانے کے بعد یا کسی اور ایسے کام میں مشغول ہو جانے کے بعد جس میں انہماک کی ضرورت ہو کر اُس کو انجام دیتے ہوئے اور کوئی بات ذہن میں نہ رہ سکتی ہو ایمان سے بجائے استحضار کے ذہول محض ہو جاتا ہے مگر یہ ذہول حکم بالایمان میں مضر نہیں تو حق تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ ایمان کے استحضار دوامی کو فرض نہیں کیا ورنہ اگر استحضار دواماً فرض ہوتا تو نہ سونا جائز ہوتا۔ اور نہ کوئی ایسا کام کرنا جائز ہوتا جس میں شدید انہماک ہو اس لئے اس میں اس قدر وسعت کر دی کہ اگر کسی وقت کسی عذر کی وجہ سے تصدیق باللسان بھی نہ ہو سکے تو تصدیق بالجنان بھی کافی ہے اور اگر تصدیق بالجنان ایک دفعہ کر کے پھر ذہول ہو گیا تو یہ بھی کافی ہے کہ ضد تصدیق کا یعنی تکذیب کا استحضار نہ ہو۔ بس یہ عدم استحضار ضد ہی استحضار ایمان سمجھا جائے گا حالانکہ اُنکی شان عظمت کا تو یہ حق تھا کہ ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی — شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

کیونکہ جتنے تعلقات یا کمالات موجب یادداشت ہو سکتے ہیں وہ سب یہاں بدرجہ اتم واکمل موجود ہیں مثلاً انعام و احسان حسن و جمال فضل و کمال علم و غنا۔ جود و سخا۔ رحم و عدل۔ قدرت فر وغیرہ یہ تمام اوصاف کمال علی وجہ الکمال حق تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں۔ جب تمام اسباب موجب ذکر اُن میں موجود ہیں تو عقل اُس کو مقتضی ہے کہ ذکر بھی ہر وقت ہونا چاہئے کیونکہ جب کمالات احسانات میں کسی آن

انقطاع نہیں تو ذکر و توجہ میں انقطاع کیوں ہو۔ اس میں بھی کسی آن انقطاع نہ ہونا چاہئے۔ یہاں ایک مسئلہ استطراداً بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ آجکل ہر بات میں عقل پرستی کا زور ہے ہر معاملہ میں اسیکو فیصلہ کے لئے حکم بنایا جاتا ہے حتی کہ شرعیات میں بھی اور شرعیات میں سے معاد میں بھی۔ اور پھر عقل بھی کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ہے ایسے عظیم فیصلہ کے واسطے۔ اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا۔ لیکن میں دعوی سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کرکے دیکھا جاوے۔ تو عقل ہماری اتنی خیرخواہ نہیں ہے۔ جتنی شریعت خیرخواہ ہے دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتوی تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دواماً ضروری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو جیسا ایک بزرگ غلبہ میں کہتے ہیں۔ ؎

ہر آں کو غافل از حق یک زمان ست | در آندم کافر است اما نہان است

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے یعنی مومن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا جو اکملیت کے درجہ پر پہونچا ہوا ہو۔ کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا۔ اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو حق تعالے کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے۔ اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد میں غفلت کرے اُسے اضافۃً کافر کہدیا ہے۔ اس سے حقیقی و فقہی کافر مراد نہیں۔ غرض غلبہ حال کا جو اقتضا ہے کہ استحضار دواماً ہو۔ عقل کا بھی وہی اقتضا ہے۔ تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ تو سب کو عاصی قرار دیتی شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کو ذہول کی اجازت دیدی اور عدم تصدیق کو بھی جبکہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا قائم مقام کردیا۔ اب بتایئے عقل زیادہ خیرخواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ یہ تو اُن عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائنس کا غلبہ ہے۔ اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسیطرح ایک اور جماعت ہے جو حقیقت کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت اور ہے حقیقت اور ہے

میں اُن کو بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ جس شریعت کی وہ ہڑبیں اُکھاڑتے ہیں وہی اُن کی خیر خواہ ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اگر حقیقت محضہ کو حکم بنایا جاوے تو زندگی تلخ اور زیست وبال اور حرام ہو جائے۔ مثلاً آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز میری ہے اور یہ زید کی اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو نہ آپ کی ہے نہ زید کی کیونکہ ؎

فی الحقیقت مالک ہر شئے خدا است　　ایں امانت چند روزہ نزد ما است

زید و عمر کی طرف محض مجازی نسبت ہے۔ مگر شریعت کے قربان جائے کہ اُس نے اس ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ حقیقت کا سا کیا ہے اور اس کا بھی پورا اعتبار کیا ہے۔ نہ کسی کی چیز غصب کرنا جائز۔ نہ بے اجازت استعمال کرنا جائز۔ اور اگر حقیقت سے پوچھئے تو ہر چیز کا وہ حال ہونا۔ جیسے مسجد کے لوٹے اور فرش جن کا کوئی مالک ہی نہیں نہ آپ نہ میں بلکہ ہر شخص کو ان کے استعمال کا حق ہے۔ گو یہ جائز نہ ہو کہ آپ اُٹھا کر گھر میں رکھ لیں لیکن استعمال کا حق تو سب کو ہے۔ اسیطرح جو کپڑے آپ نے گٹھڑی میں باندھکر گھر میں رکھے ہیں اُن کا بھی یہی حال ہونا کیونکہ وہ بھی آپ کے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں۔ اور خدا کی چیز میں ہر شخص کا حق مساوی ہے سو آپ نے جو انھیں باندھکر گھر میں رکھا ہے اگر حقیقت ہی حکمراں ہوتی تو یہ آپ کا فعل کیسے جائز ہوتا۔ اور اگر پھر بھی آپ ایسے ہی حقیقت پرست ہیں تو کوئی شخص آپ کی اچکن آپ کے بدن پر سے اُتارنے لگے کہ اتنے دن تک آپ پہنے رہے اب میں پہنوں گا۔ تو آپ اُسے منع نہ کیجئے۔ واقعی اگر شریعت نہ ہوتی تو دنیا میں لوٹ اور غارت کا بازار گرم ہو جاتا اور امن و چین رخصت ہو جاتا مولانا رومی نے ایک ایسے ہی حقیقت پرست جبری کی حکایت لکھی ہے۔ کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا۔ اور جا کے درختوں کے پھل توڑ توڑ کے کھانا شروع کر دئے۔ مالک کو خبر ہوئی اُس نے منع کیا تو آپ کہتے ہیں کہ باغ بھی خدا کا اور درخت بھی خدا کا اور پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا۔ غرض آکل بھی خدا کا اور ماکول بھی خدا کا۔ تو ہے کون منع کرنے والا۔ اور تیرا اس میں ہی کیا مالک تھا حکیم اُس نے نوکر سے ڈنڈا اور رسّا منگایا۔ اور باندھ کے مارنا شروع کر دیا۔ اب تو لگا غل مچانے۔ اُس نے کہا کہ ڈنڈا بھی خدا کا اور رسّا بھی

خدا کا تو بھی خدا کا میں بھی خدا کا غرض ضارب بھی خدا کا اور مضروب بھی خدا کا پھر تو کیوں غسل مچاتا ہے بس پھر کیا تھا۔ ؎

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیارست اختیارست اختیار

ہوش درست ہو گئے یہیں سے توحید وجودی خالی از شریعت کے اثر کا مسئلہ حل ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

سر پنہان ست اندر زیر و بم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

اس کی تفسیر میں نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ سے یہ سنی ہے کہ سر پنہاں سے مراد توحید وجودی ہے مگر وہ نہیں جو ملحدین کی ہے۔ بلکہ توحید وجودی حقیقی جو محققین کی ہے مولانا فرماتے ہیں کہ چونکہ افہام صحیح نہیں ہیں اس لئے میں اُسے اگر صاف صاف بیان کردوں تو اُس کو غلط سمجھکر لوگ عالم میں فساد مچادیں۔ یہ نہیں کہ توحید وجودی کا مسئلہ مضر ہے بلکہ افہام ٹھیک نہیں ہیں ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے اس لئے اندیشہ ہے کہ اُس کے اظہار سے ایک طوفان بے تمیزی عالم میں مچ جائے جس کو ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یہی معنے ہیں جہاں برہم زنم کے بطور اسناد الی السبب کے تو یہ شریعت کی رحمت ہے کہ اس نے ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ ملک حقیقی کا سا کیا ہے کہ مثلاً میراث کے ذریعہ سے جو چیز کسی کے پاس آوے۔ وہ اُس کی ملک ہے یا بیع کے یا ہبہ کے ذریعہ سے اُسکے پاس آوے وہ بھی ملک ہے۔ رہے مباحات عامہ وہ کسیکی ملک نہیں۔ مگر قبضہ کرنے کے بعد وہ بھی قابض کی ملک ہیں۔ مثلاً پانی یا خودرو گھاس یا جنگل کا جانور شکار اور مچھلیاں۔ ان پر جو اول قبضہ کرے اوسی کی ملک ہے۔ دیکھئے شریعت کی بدولت کس قدر انتظام درست ہے۔ اگر یہ نہ ہو تمدن ہی درست نہ ہو۔ ایک غدر مچ جاوے اور ہر وقت وہ کیفیت رہے جیسے ڈاکہ پڑا کرتا ہے۔ کہ آپ نے مجھ سے چھین لیا اور آپ سے اُس نے چھین لیا۔ غرض ہر وقت جنگ کا سا منا رہتا۔ اب بتلائیے حقیقت ہم پر زیادہ شفیق ہے یا شریعت مقدسہ تو اب سمجھ لیجئے حق تعالےٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دنیا میں عقل پرست اور حقیقت پرست

دونوں گروہ پیدا ہوں گے۔ اور دونوں کے مقتضا پر عمل کرنے سے یہ تنگی ہوگی۔ اس لئے شریعت کو نازل فرمایا جس نے ہر قسم کی تنگی کو دور کر دیا۔ اسی احسان کا اعلان فرماتے ہیں۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ کتنے بڑے دعوے کے لفظ ہیں۔ حضرت یہ دعویٰ آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ ہر طبیعت کے لوگ موجود ہیں۔ اور ہر زمانہ میں ہوتے آئے ہیں۔ اگر اس دعوے میں کچھ بھی خامی ہوتی تو اس شد و مد سے تائید کے ساتھ نہ فرماتے۔ شاید اس مقام پر کسیکو شبہ ہو کہ ہم تو دین میں تنگی کا کھلا مشاہدہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص شریعت پر عمل کرتا ہے اُس کے ہر کام میں روڑے اٹکتے ہیں۔ ہم اپنے معاملات کے لئے چند مسئلہ پوچھنے گئے تھے تو مولانا نے جو جواب دئے کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز تو اُن میں زیادہ جواب یہی ملا تھا کہ ناجائز ہے۔ چنانچہ ہم قرض لیتے ہیں مگر سود کے بغیر نہیں ملتا۔ اور بغیر قرض کے کام نہیں چلتا۔ اور شریعت سود کو حرام بتلاتی ہے۔ اب اُس موقع پر عقل پرست تو یہ کہے گا کہ دین میں سخت حرج ہے بلکہ آجکل تو عقل پرستوں کا اجماع ہے کہ ساری خرابی شریعت ہی کی بدولت ہے۔ چنانچہ لکھنؤ کا ایک قصہ یاد آیا کہ ایک صاحب میرے پاس روزانہ آتے تھے وہ ایک روز ذرا دیر میں آئے۔ میں نے تاخیر کا سبب پوچھا تو کہا کہ ایک جلسہ کی شرکت کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ جس میں مسلمانوں کے اسباب تنزل پر غور کیا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا آخر کیا طے ہوا اُنھوں نے کہا اخیر یہ طے ہوا کہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ مسلمانوں کی تنزل کا سبب اسلام ہے۔ وجہ یہ کہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے ہر کام میں رکاوٹ ہے۔ چنانچہ جس قوم کے فرائض بیان کرکے مسئلہ پوچھتے ہیں تو فتوے عدم جواز کا ملتا ہے۔ تجارت کے طریقوں کے متعلق پوچھنے پر کسیکو قمار بتایا جاتا ہے کسیکو ربوا۔ جب ہر قدم پر ناجائز کا فتوی ہے تو اب بجز اس کے کہ بیکار بیٹھ رہیں اور کیا کریں۔ اب شبہ یہ ہے کہ جب ہر ہر قدم پر تنگی اور حرج ہے تو پھر قرآن میں حرج کی نفی کیسے کی گئی۔ اب اس شبہ کا جواب سنئے کہ خدا تعالیٰ کو اس زمانہ کا بھی علم تھا۔ اور باوجود اس کے پھر جو فرماتے ہیں

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ۔ سو کوئی تو بات ہے جس پر اتنا بڑا دعوے کیا گیا ہے ورنہ نزول قرآن کے زمانہ سے آج تک کسی نے اس نفی پر کیوں نہ اعتراض کیا حالانکہ ہر زمانہ میں مخالفین بکثرت رہے ہیں۔ پھر نفی بھی معمولی نہیں۔ نکرہ ہے تحت میں نفی کے جس کے معنے یہ کہ ذرا سی اور چھوٹی سے چھوٹی تنگی بھی نہیں ہے۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو جو یہ پہاڑ کی برابر تنگی نظر آرہی ہے یہ تنگی واقع میں آپ میں ہے شریعت میں نہیں جیسا مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

حملہ بر خود میکنی اے سادہ مرد	ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

حقیقت میں تنگی اُدھر سے ہے اُدھر سے نہیں ہے۔ معترض نے تنگی کا محل نہیں دیکھا۔ اپنی تنگی کو شریعت کی تنگی سمجھ گیا۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہماری بستی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت بچہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی۔ چاند دیکھنے کا وقت تھا۔ سب چاند دیکھنے لگے۔ وہ بھی جلدی سے پاخانہ صاف کرکے چاند دیکھنے کھڑی ہوئی۔ اتفاق سے کچھ پاخانہ اُس کی اُنگلی میں لگا رہ گیا تھا۔ عورتوں کی عادت کے موافق ناک میں اُنگلی رکھلی۔ تو اُنگلی میں سے بو آئی۔ کہنے لگی اے ہے آج سڑا ہوا چاند کیوں نکلا۔ اب تمام عقلا سمجھتے ہیں کہ چاند سڑا ہوا نہ تھا۔ اُس کی اُنگلی سڑی ہوئی تھی۔ اور یہ اُس کی حماقت تھی جو اُسے اپنی اُنگلی کی گندگی کی خبر نہ ہوئی اور چاند کو سڑا ہوا کہنے لگی اسیطرح تنگی ہمارے اندر ہے شریعت میں نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طبیب حاذق کے پاس ایک مریض گیا کسی گوردہ کا رہنے والا۔ جہاں نہ دوا ملتی ہے نہ پرہیزی غذا ملتی ہے۔ تخم کاسنی اسطوخودوس بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اب حکیم صاحب نے اُسے نسخہ لکھدیا۔ اُس نے کہا حکیم صاحب کیا کھائیں۔ حکیم۔ بکری کا گوشت۔ مریض یہ تو ہمارے یہاں نہیں ملتا۔ حکیم۔ اچھا تری کا سالن۔ مریض۔ یہ بھی نہیں ملتا حکیم۔ اچھا کدو پالک کا ساگ مریض جی یہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ حکیم۔ آخر پھر کیا ملتا ہے مریض۔ کریلے ملتے ہیں۔ حکیم۔ دیکھو کریلے نہ کھانا۔ مریض۔ بینگن ملتے ہیں۔ حکیم بینگن بھی نہ کھانا۔ اس نے کہا ارے صاحب اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اب یہ

مگر بعض صاحب بہت تنگ دل ہوگئے اور ناک منہ چڑھا کے آئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ طب یونانی بہت تنگ ہے۔ حکیم صاحب سے جو کچھ بھی پوچھو اُس کے کھانے کو منع کرتے ہیں۔ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کا مطب تنگ ہے۔ یا اس دیہاتی کا قانون تنگ ہے اب سمجھئے کہ شریعت کی تنگی تو جب ثابت ہوتی کہ سب لوگ مل کر شریعت پر عمل کرتے پھر بھی نہ ہو سکتا۔ بتلایئے یہ تنگی ہے کہ وسعت ہے۔ یقیناً اس کو کوئی تنگی نہیں کہہ سکتا۔ مثلاً بیع ہے کہ بعت و اشتریت سے ہو جاتی ہے بلکہ اُس کے کہے بغیر بھی ہو جاتی ہے جسے بیع تعاطی کہتے ہیں۔ تنگی تو جب ہوتی کہ ایسا ہوتا کہ جب تک ایک ہزار مرتبہ بائع بعت اور مشتری اشتریت نہ کہے اُس وقت تک بیع نہ ہوگی۔ ریل پر بیٹھے ہیں سودا لیا ہے اور اس وظیفہ کے پورا ہونے تک ریل ٹھہرتی نہیں۔ تب واقعی مشکل ہوتی۔ اب کیا مشکل ہے۔ اور جس جگہ آپ کو اشکال نظر آتا ہے اُس کا منشا یہ ہے کہ آپ تنہا شریعت کے موافق معاملہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا شخص اس کی پروا نہیں کرتا۔ تو اس طرح تو ہر قانون تنگ ہو جائے گا۔ آپ کوئی قانون شریعت کا ایسا بتلا دیجئے کہ سب ملکے اُس پر عمل کرنا چاہیں اور نہ ہو سکے۔ اس لئے نہایت قوت کے ساتھ فرماتے ہیں۔ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ بہرحال اتنا بڑا دعوےٰ عقل پرستی کے زمانہ میں اگر واقعی دین میں سہولت نہ ہوتی۔ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ بحمد اللہ شبہ کا جواب ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ بیان ہو رہا تھا۔ کہ شریعت کی سہولت و رعایت اس قدر ہے کہ عدم اعتقاد ضد کو قائم مقام کر دیا۔ اعتقاد توحید کا۔ یہ تو شریعت کی شفقت ہے۔ اور عقل کا فتوےٰ یہ ہے کہ ہم اعتقاد توحید کا دوامًا استحضار رکھیں۔ تو زیادہ خیر خواہ کون ہوا عقل کے ان ہی آثار کو دیکھکر تو مولٰنا فرماتے ہیں۔ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را	بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل کو پھینک ہی دیں کہ محض بیکار ہے۔ نہیں وہ بہت کار آمد ہے۔ مگر ایک حد کے اندر اندر۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص پہاڑ پر چڑھتا

چاہتا ہے۔ اور اُس پر اتنی چھوٹی اور ایسی اونچی سیڑھیاں ہیں کہ اُنپر گھوڑا نہیں چڑھ سکتا۔ ہاں دامن کوہ تک تو پہونچا سکتا ہے تو کیا پہاڑ پر کارآمد نہ ہونے سے گھوڑا بالکل بیکار ہوگیا۔ ہرگز نہیں کیونکہ دامن کوہ تک یہی بہت مسافت ہے جس میں گھوڑے سے مدد ملتی ہے۔ بس یہی حال عقل کا ہے۔ کہ توحید و رسالت اور اصول اسلام کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہے۔ اصول کو تو عقل سے سمجھ لیجئے۔ اس کے بعد اس کو بالکل چھوڑ دیجئے۔ ورنہ گھوڑے کی طرح گرے گی اور خواہ مخواہ آپ کی بھی ہڈیاں پسلیاں توڑے گی۔ جب خدا کا خدا ہونا۔ اور رسول کا برحق اور مطاع ہونا عقل سے ثابت ہوگیا۔ بس اب اُسے چھوڑ دیجئے۔ اور آگے عشق و محبت سے کام لیجئے اور اس طرح سے اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے۔ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   جان شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

یعنے جب توحید و رسالت کو سمجھ لیا تو اُس کے بعد اب ضرورت اس کی ہے کہ جو ارشاد ہو آمنا وصدقنا۔ نہ یہ کہ خواہ مخواہ اُس میں شبہات پیدا کریں کہ صاحب پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے عذاب قبر عقل کے خلاف ہے۔ جب مردہ میں جان ہی نہیں ہے تو عذاب کس پر۔ اور اگر کہو جسم پر عذاب ہے تو ہم جسم کو بھی فنا کر دیں گے اور ہم نہ کریں تو چار دن میں وہ خود ہی فنا ہو جائے گا۔ پھر عذاب کیسے ہوگا۔ جیسے کسی افیونی کی ناک۔ پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی اور وہ بار بار اُڑا دیتا تھا۔ آخرکار جھنجھلا کے ناک ہی کاٹ ڈالی کہ لے اب اُڈا ہی نہیں رہا۔ اب کہاں بیٹھے گی۔ اسی طرح جب وہاں قبر میں مردہ ہی گل سڑ کے ختم ہوگیا تو اب عذاب کس پر ہوگا۔ صاحبو ہمارے پاس جواب ہر شبہ کا ہے۔ بحمد اللہ علماء جواب سے قاصر نہیں ہیں۔ مگر یہ غور کرو کہ آیا ان شبہات کا جواب دینا علماء کا فرض منصبی ہے بھی یا نہیں۔ اُس کو بھی ایک مثال سے سمجھئے آپ کا ایک مقدمہ ہے کسی جج کے اجلاس پر اُس نے آپ کا مقدمہ ہرا دیا۔ اور دفعہ کا حوالہ بھی دیدیا۔ اب آپ جج کے پاس جاویں کہ صاحب فیصلہ تو قانون کے موافق ہے مگر خود قانون میں سقم عقلی ہے۔ اس لئے مجھے اس میں کلام ہے۔ تو جج کیا کریگا

وہ کہے گا کہ ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ بس جو قانون ہے ہم اُسی کے پابند ہیں۔ اور تمام عقلاء جج کے اس جواب کو معقول اور صحیح کہیں گے اور اُس دفعہ پر جو اس شخص کے اعتراضات ہیں اُن کا جواب دینا جج کے ذمہ نہ سمجھیں گے۔ تو تعجب کی بات ہے کہ جج کا یہ کہنا تو کافی سمجھا جائے گا۔ اور علماء کا یہ کہنا کہ حکم الٰہی یہی ہے۔ کافی نہ سمجھا جاوے کیونکہ جس طرح حاکم بالقانون ہے واضع قانون نہیں ہے۔ اسیطرح علماء بھی عالم بالقانون ہیں واضع قانون نہیں ہیں۔ اُن کے ذمہ قانون کا بتلا دینا ہے۔ لم اور وجہ کا بتلانا نہیں ہے گو وہ احکام کی لمیات کو بکثرت جانتے ہیں۔ لیکن جاننے کے بعد بتلا دینا اُن پر ضروری نہیں۔ بلکہ سوال عن العلل کے جواب میں اُن کا یہ کہدینا کافی ہو گا کہ ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رندان خبرے نیست کہ نیست

پس علماء پر ضرور نہیں ہے اسرار کا ظاہر کرنا بلکہ صوفیہ کرام جو زیادہ غیور ہیں وہ تو اظہار کی ممانعت کرتے ہیں اور یہانتک کہتے ہیں۔ ؎

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

دیکھئے صوفیہ تو اظہار اسرار سے بالکل منع ہی کرتے ہیں۔ اور علماء بچارے تو کبھی کبھی بتا بھی دیتے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ صوفیہ پر کچھ اعتراض نہیں کیا جاتا۔ جو کچھ لمبختی ہے علماء ہی کی ہے۔ کہ اُن کی تو نماز بھی ناجائز۔ اور صوفیہ کی گالیاں بھی جائز۔ بس جی اب تو علماء بھی صوفیہ بنیں تو کچھ کام چلے۔ مگر خدا کے لئے دوکاندار صوفی نہ بنیں۔ بلکہ سچ مچ کے صوفی بنیں۔ تو جب علماء کا یہ اظہار علل فرض منصبی نہیں تو وہ کیوں ظاہر کریں۔ بلکہ صرف ضابطہ کا جواب دیکر بات کو ختم کردیں۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے درس میں ایک طالب علم تھے عبی۔ اُنھوں نے پوچھا کہ حضرت ایام حیض کے روزہ کی تو قضا ہے اور نماز کی قضا نہیں ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کروگے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر میں ایک بال نہ رہیگا۔ مولانا حکیم تھے۔ اسی باب میں اُن کا ایک شعر ہے ؎

الوعظ ینفع لو یا لعلم و الحکم　　　و السیف ابلغ وعاظ علی القمم

توضرورت ضابطہ کے جواب کی بھی ہے تاکہ لوگوں کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوتا رہے بہرحال ایمان لانے کے بعد ضرورت نہیں لم و کیف کی۔ بلکہ وہ مسلک رکھنا چاہیئے جیسا عارف گنجوری فرماتے ہیں۔ ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو　　　نینگیختن علت از کار تو

غور سے سننے کی بات ہے۔ کہ اگر کسیکو تعشق ہو جاوے کسی مردار کے ساتھ یا کسی بڑے مرد کے ساتھ یعنے امرد کے ساتھ کہ جس میں افعل التفضیل کا ہمزہ بھی لگا ہوا ہے یا کسی بازاری عورت کے ساتھ اور وہ کہتی ہو کہ میں اُس وقت ملوں گی کہ تم پہلے کرتہ ٹوپی اُتار کے سات دفعہ بازار کے بیچ سے ننگے طواف کرتے ہوئے نکل جاؤ۔ اگر یہ واقعی محب ہے توکبھی یہ نہیں پوچھے گا کہ مجھے اس طرح رسوا کرانے میں تیرا کیا نفع۔ بلکہ کہے گا کہ بہت اچھا۔ اور پاجامہ بھی اُتارنے کو تیار ہو جائے گا۔ اور اگر کوئی ملامت بھی کرے گا۔ تو اُسے یہ جواب دے گا۔ ؎

نہ سازد عشق را کنج سلامت　　　خوشا رسوائی کوئے ملامت

اسیطرح وہ اگر تپانچا سن چپت بھی لگاوے تو بُرا نہ مانیگا۔ بلکہ اگر قتل بھی کرے تو راضی رہیگا اور یہ کہے گا۔ ؎

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

تنویر میں ابن عطار نے ایک حکایت لکھی ہے۔ کہ کوئی شخص کسی پر عاشق ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ پکڑا گیا اور اُس کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ جب کوڑے مارے جا رہے تھے تو وہ بالکل خاموش تھا۔ یہاں تک کہ ننانوے کوڑے لگ چکے۔ جب سوواں کوڑا مارا گیا تو آہ کی۔ کسی نے پوچھا یہ کیا۔ کہ ننانوے کا تو تحمل کر لیا۔ اور ایک کا تحمل نہ کر سکا۔ کہا ننانوے تک محبوب دیکھ رہا تھا۔ اور جب سوواں لگا۔ تو وہ چلا گیا تھا۔ ؎

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست　　　تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

محبوب کے سامنے تکلیف میں بھی مزہ ہے۔ یہی وہ مراقبہ ہے جس کی تعلیم حق تعالیٰ نے اپنے محبوب کو دی ہے۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ یعنے آپ صبر کیجئے (مخالفین کی باتوں پر اور یہ صبر اس لئے آسان ہوسکتا ہے۔ کہ) آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں جو کچھ ہو رہا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہوئے ہو رہا ہے۔ تو کشتن کی تکلیف تو ہے مگر تو نیز بر سر بام آکی راحت بھی ہے۔ جس سے یہ کلفت سہل ہو جاتی ہے خلاصہ یہ کہ معشوق کی امر و نہی بھی ناگوار نہیں ہوتی اس کی مارکوٹ بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ یہ جو احکام تشریعیہ ہیں۔ یہ تو محبوب کے اوامر و نواہی ہیں اور احکام تکوینیہ محبوب کی مارکوٹ ہے۔ کہ آج بیمار ہیں۔ آج زخم ہے آج دنبل ہے۔ اور جو ان کا واقعی عاشق ہے۔ اس کا ان دونوں میں یہ مسلک ہے۔ ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش	گر ریش بینند و گر مرہمش
گدایان از پادشاہی نفور	بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند	وگر تلخ بینند دم درکشند

تو بس بعد تحقیق اصول کے کہ وہ عقلی ہیں ایسی چیز کی ضرورت ہے جو آگے پہاڑ پر چڑھانے والی ہو۔ تو معلوم ہوگیا کہ عقل کی عملداری کہاں تک ہے اور عشق کی کہاں سے۔ اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں ہوائی جہاز کی ضرورت ہے وہاں گھوڑے کو لیجاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ گھوڑے کو ماریں گے اور اپنی بھی ہڈی توڑینگے اسی لئے تو کہتے ہیں۔ ؎

آزمودم عقل دور اندیش را	بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

اب تو آپ کو عقل کی حد معلوم ہوگئی کہ یہ بیکار تو نہیں ہے۔ مگر ایک خاص حد تک کارآمد ہوسکتی ہے اس سے آگے نہیں۔ اب یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ کہ عقل شریعت سے زیادہ شفیق ہے جیسا کہ اوپر اس کی دلیل بھی مذکور ہوئی ہے اور پھر مع شئے زائد ذکر کرتا ہوں کہ عقل کا مقتضا، تو یہ تھا کہ کسیوقت بھی ذکر و توجہ سے غافل نہ ہو۔ مگر شریعت مقدسہ نے عدم توجہ کی بھی اجازت دیدی ہے۔ پھر اجازت بھی مطلق نہیں بلکہ اس کا بھی

بڑا درجہ۔ کیونکہ اجازت کے دو مرتبے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ حالت بے توجہی معصیت نہیں گو ناقص ہے۔ سو شریعت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس پر رنج کرنے سے بھی ممانعت فرمادی ہے۔ حالانکہ یہ شخص اکمل کے مقابلہ میں ناقص ہے۔ مگر خود اُسے ناقص سمجھنے کی بھی اجازت نہیں ہے یہ اجازت کا دوسرا مرتبہ ہے کہ معصیت کی نفی کرکے اپنے کو ناقص سمجھنے سے بھی منع کردیا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہؓ کی ملاقات ہوئی۔ حضرت صدیق اکبرؓ سے اُنھوں نے پوچھا۔ اے حنظلہ کیسے ہو۔ جواب دیا نافق حنظلۃ حنظلہ (یعنے میں) تو منافق ہوگیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا یہ کیسے فرمایا۔ کہ جب ہم حاضر ہوتے ہیں دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت و دوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور جب وہاں سے آتے ہیں تو بال بچوں میں مشغول ہو کر سب بھول جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی منافق ہوں۔ کیونکہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں۔ آؤ چلو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا علاج پوچھیں چنانچہ حضور کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا۔ آپ نے فرمایا یاد رکھو۔ لو کنتم کما تکونون عندی لصافحتکم الملئکۃ و لکن یا حنظلۃ ساعۃ ساعۃ (یعنے اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ تمھاری ہر وقت وہی حالت رہتی جو میرے سامنے ہوتی ہے تو تم سے ملائکہ مصافحہ کیا کرتے مگر اے حنظلہ ایک ساعت کیسی اور ایک ساعت کیسی) اس حدیث کے سمجھنے میں علماء قشیریہ پریشان ہوگئے اول تو اُن کو نافق حنظلۃ پر اشکال ہوا۔ کہ محض تفاوت حالت کو اُنھوں نے نفاق کیسے کہدیا۔ پھر حضور کے جواب پر اُن کو شبہ ہوا۔ کہ اس جواب سے حضرت حنظلہ کا اشکال کیونکر حل ہوا۔ اس جواب کی شرح صوفیہ سمجھے۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔ کہ مقصود تو حضور کا حضرت حنظلہ کی تسلی کرنا ہے مگر سوال یہ ہے اس جواب سے تسلی کیسے ہوگئی۔ اول تو یہ سمجھئے کہ یہاں نفاق سے حقیقی نفاق مراد نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ و حضرت حنظلہ ضرور یہ بات جانتے تھے کہ نفاق نام ہے ابطان الکفر و اظہار الایمان کا۔ اور جب ہم جانتے

ہیں تو کیا وہ نہیں جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں ابطان الکفر نہ تھا۔ مگر مجازاً اُس کو نفاق کہدیا۔ اور اس کا منشاء یہ تھا کہ حالت حضور میں ایمان کامل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت عالم غیب رائے العین ہوتا ہے تو تصدیق بھی کامل ہوتی ہے اور حالت غیبت میں تصدیق کی یہ شان نہیں ہوتی صرف عقلی تصدیق ہوتی ہے جو علم کا درجہ ہے معاینہ و مشاہدہ کی سی کیفیت نہیں ہوتی۔ اس تفاوت کی وجہ سے وہ یہ سمجھے کہ ہمارا ایمان حضور کے سامنے اور طرح کا ہوتا ہے پیچھے اور طرح کا ہوتا ہے گویا کبھی کامل ہے کبھی ناقص ہے اور مطلوب ایمان کامل ہے تو جب اس میں نقص ہوگا وہ نفاق کے مشابہ ہوگا۔ گو حقیقی نفاق نہ ہو۔ یہ تو نافق حنظلہ کی تفسیر ہوئی۔ اب سوال یہ ہے کہ حضرت حنظلہ نے اپنی حالت ادنی درجہ کی سمجھکر اُس پر تاسف کا اظہار کیا تھا تو جواب میں کوئی تسلی کا مضمون ہونا چاہئے اور جو جواب حدیث میں مذکور ہے بظاہر وہ تسلی کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ ساعۃً ساعۃً ہی پر تو اُنھیں تاسف ہے۔ پھر یہ جواب وجہ تسلی کیونکر ہو سکتا ہے۔ میرے اُستاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی۔ کہ حکمت حق اس کو مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے۔ اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضور کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا۔ بلکہ ملکوت میں پہونچا دیا جاتا۔ اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے اجمالاً اتنا بتائے دیتا ہوں کہ باہم دو شخصوں میں مصافحہ جب ہوتا ہے عادتاً ایک عالم میں ہوتا ہے اور جس عالم میں ہم ہیں یہ محسوس ہے اگر یہ مصافحہ یہاں ہو تو ملائکہ بیشک محسوس ہونگے عادتاً مصافحہ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ محسوس ہونے کی کیا ضرورت ہے یوں ہی مصافحہ کرنے تو سمجھو محسوس کے معنی مرئی یا مبصر کے نہیں ہیں لمس بھی تو حواس میں سے ہے تو مصافحہ کم از کم بغیر لمس کے نہیں ہوتا۔ جو لوگ آنکھ سے معذور ہیں وہ بھی تو اس کے حصہ دار ہیں گو لامسہ ہی سہی۔ بہرحال اس عالم میں مصافحہ ہونا عادتاً موقوف اس پر ہے کہ ملائکہ محسوس ہوں اور عادتاً ملائکہ صرف ملکوت میں محسوس ہوتے ہیں ناسوت میں محسوس نہیں ہوتے۔ تو وہ مصافحہ

اس طرح ہوتا کہ ہم ملکوت میں منتقل کر دئے جاتے۔ تو اب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کر دئے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمھارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی اُس کا ابطال لازم آتا۔ تو اس غیبت پر تاسف و قلق کرنا گویا اس ابطال حکمت کی تمنا کرنا ہے۔ جو کہ غیر محمود ہے تو اس ذہول و غیبت کی اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت ہو گیا۔ تو کتنی بڑی رحمت ہے شریعت کی بمقابلہ عقل کے اور صوفیہ نے اس حکمت کو اس تقریر سے بھی زیادہ واضح و سہل عنوان سے ظاہر کر دیا ہے وہ فرماتے ہیں۔ ؎

از دست ہجر یار شکایت نہ می کنم	گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

یعنے جس طرح بدون پیاس کے پانی کی قدر نہیں اسیطرح غیبت ہی کی بدولت حضور کی لذت ہے گو حضور کی حالت فی نفسہ افضل و اکمل ہے۔ مگر حضور کی روح و لذت خود غیبت پر موقوف ہے اس لئے اس عارض پر نظر کر کے حالت اکمل و اعلیٰ یہی ہے کہ کبھی غیبت ہو کبھی حضور ہو۔ اسیواسطے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک خادم کو جواب دیا تھا جنھوں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسے پہلے آیا کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا میاں تم کو خبر نہیں۔ پورانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں پورانی سے مراد بڑھیا نہیں بلکہ جوان بھی رہے تب بھی ویسا ذوق و شوق باقی نہیں رہتا۔ اور اگر کچھ دنوں کے لئے جدائی ہو جاوے مثلاً کہیں سفر سے آویں تو اس وقت پھر ایک خاص کیفیت شوق کی عود کر آتی ہے سو یہ حکمت ہے اس انقطاع توجہ میں کہ غیبت ہی پر حضور کی لذت موقوف ہے اس کے علاوہ دوسری حکمت یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ باوجود عدم تقاضا کے حق کی عبادت کرتا رہے۔ تیسرے یہ کہ حضور کے وقت معاصی کا تقاضا بھی نہیں ہوتا اس لئے اگر اس وقت معاصی سے بچے تو کیا کمال ہے وہ تو فرشتے بھی کرتے ہیں۔ انسان کا کمال یہی ہے کہ تقاضائے معصیت کے ساتھ پھر معاصی سے بچے۔ پس اگر حضور دائمی ہوتا تو انسان گویا فرشتہ ہو جاتا انسان نہ رہتا۔ اور جب آپ آپ نہ رہے تو آپ کا

کمال ہی کیا ہوا۔ غرض یہ کہ اگر یہ حالت غیبت نہ ہوتی تو آپ بھی فرشتہ بن جاتے حکمت مقتضی تھی انسان کو بنانے کی اس لئے اس حکمت حق کا تقاضا دوسرے انسانوں کے بنانے کا ہوتا جو انسان بن کر کام کرتے تو آپ ہی کیوں نہ انسان رہیں اور خدا کو خبر اس میں کیا کیا حکمتیں ہوں گی یہ تو وہ ہیں۔ جو ہم جیسے ضعفا بھی سمجھ لیتے ہیں ورنہ حکمتیں تو غیر متناہی ہیں۔ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔ سو حق تعالیٰ کے کلمات و اسرار و حکم کا کون احاطہ کر سکتا ہے۔ اگر تمام دنیا کے موجودات کاتب ہوں اور تمام روئے زمین کے سمندر روشنائی بنجائیں تو سب ختم ہو جائیں۔ مگر وہ ختم نہ ہوں۔ مگر اہل اللہ کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں اُس میں سے کچھ ہم لوگوں کی قناعت کے لئے بیان بھی کر دیتے ہیں۔ اب سمجھ میں آگیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا جواب کیسا تسلی بخش جواب ہے کہ یہی حالت قرین حکمت ہے کہ کبھی کچھ ہو کبھی کچھ ہو۔ اسیواسطے جو عارف ہیں وہ ایسے ذہول کو مضر نہیں سمجھتے۔ مگر اُن کا ذہول ہمارا سا ذہول نہیں کہ ہمیں بالکل کچھ پتہ ہی نہیں رہتا۔ اُن کا ذہول بس اتنا ہوتا ہے۔ کہ استحضار کا غلبہ نہیں رہتا۔ جیسے عاشق کو معشوق کا ذہول کلی تو کبھی نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی کبھی بے کلی ہوتی ہے اور کبھی کچھ سکون بھی ہو جاتا ہے۔ بس وہی عارف کا ذہول ہے اور اسیکو وہ فراق کہتے ہیں۔ اُن میں جو محقق نہیں ہیں وہ اس حالت پر متاسف ہوتے ہیں اور محقق کو گو طبعاً قلق ہوتا ہے مگر وہ اُسے عقلاً دفع کرتا ہے۔ چنانچہ اسی غلبۂ استحضار کا نام اصطلاح میں وصل اور ذہول کا نام فراق ہونے کی بناء پر عارف محقق کہنے لگتا ہے۔ ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب	کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

یہ فراق حقیقی نہیں۔ بلکہ فراق صوری مراد ہے۔ یعنی جب غلبہ استحضار کا نہ ہو بس وہ اُن کی اصطلاح میں فراق ہے۔ اور جس فراق کی علے الاطلاق حافظ نے مذمت کی ہے وہ اصطلاحی فراق نہیں ہے بلکہ وہ لغوی فراق ہے یعنے ذہول محض چنانچہ

کہتے ہیں۔ ؎

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعان گفت — فراق یار نہ آں میکند کہ تو ان گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر — کنایتے است کہ از روز گار ہجران گفت

تو دونوں قولوں میں اب تعارض نہیں رہا ابتدائے عشق میں یہی اصطلاحی فراق قلق میں ڈالتا ہے۔ اور انتہائے عشق میں رضا کا غلبہ تسلی دیتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ عشق کے مقتضیات میں سے یہ بھی ہے کہ جو محبوب پسند کرے اُسے یہ بھی پسند کرے مثلاً محبوب نے دو روپیے دئے کہ آم خرید لاؤ۔ تو جو محقق تھا وہ تو چلا گیا۔ اور جو ہوسناک تھا وہ وہیں مچل گیا کہ ہائے میں دولت دیدار کو چھوڑ کر بازار کیسے جاؤں یہ تو بعد ہے وصل کے بعد فراق کو کیسے گوارا کروں اور محقق اسوقت یوں کہتا ہے۔ ؎

اُرید وصالہ و یرید ہجری — فاترک ما أرید لما یرید

میں پاس رہنا چاہتا ہوں اور محبوب دور رکھنا چاہتا ہے میں اپنی مراد کو اُس کی مراد پر فدا کرتا ہوں اور جو اُس کی تجویز ہے وہی مناسب ہے اسی کا ترجمہ حافظ شیرازی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق — ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

تو محقق عاشق اس فراق ہی کو ترجیح دے گا گو اُس میں بے کلی ہی ہو ہوا کرے کیونکہ محبوب تو خوش ہے اور محققین نے اسی اصل پر جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفسیر کی ہے کہ انہ لیغان علی قلبی وانی استغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ یعنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب پر بھی ایک پردہ سا پڑتا ہے جس کے لئے میں استغفار کرتا ہوں۔ دن میں سو مرتبہ یا ستر مرتبہ۔ علماء تو یہاں گھبرائے کہ حضور کے قلب پر پردہ کیسا۔ مگر صوفیہ نے اس کی شرح کی ہے اس غین یا غیم کی پوری حقیقت تو وہی بیان کر سکتا ہے۔ جس کو وہ مقام حاصل ہو مگر مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ۔ کچھ کچھ نمونہ کے طور پر بیان کرنے میں مضائقہ بھی نہیں۔ سو صوفیہ کہتے ہیں کہ آپ کا جو درجہ علیا ہے اُس کے اعتبار سے بھی ایک مرتبہ ذکر کا اور ایک مرتبہ ذہول کا

تھا گو واقع میں وہ ذہول نہ تھا۔ کیونکہ آپ کی شان تو یہ تھی۔ کان یذکر اللہ فی کل احیانہ آپ ہر وقت ذکر کرتے تھے۔ مگر ذکر بھی دو قسم کا ہے ایک ذکر بواسطہ ایک ذکر بلا واسطہ جیسے محبوب کا مشاہدہ کہ ایک بواسطہ ایک بلا واسطہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مشاہدہ تو یہ ہے کہ چہرہ پر نگاہ اُٹھا کر دیکھ لیا۔ اور ایک یہ ہے کہ محبوب کہتا ہے۔ کہ اس وقت ہماری طرف نگاہ مت کرو۔ آئینہ میں جو ہمارا چہرہ نظر آتا ہے۔ اُسے دیکھو۔ ہے تو یہ بھی مشاہدہ ہی مگر دونوں درجوں میں بڑا فرق ہے۔ اور عاشق کو طبعًا یہ واسطہ گراں ہوتا ہی گو عقلاً گراں نہ ہو مگر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ ہو وہ تو وسائط کے ارتفاع کی تمنا میں یہ کہتے ہیں۔ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　گوش را نیز حدیث تو شنیدم ندہم

سو گو عاشق طبعًا اس واسطہ کو بھی گراں سمجھتا ہے مگر حکم ہے محبوب کا۔ کہ ہمیں اس وقت آئینہ ہی میں دیکھو اس لئے عقلاً اس سے راضی ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ کہ اہل اللہ نے ثابت کر دیا ہے کہ مخلوقات مرأۃ جمال الٰہی ہیں کہ اُن میں غور کرنے سے حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمالات کا پتہ چلتا ہے۔ پھر مرآتیت میں بھی مختلف درجے ہیں۔ عوام کے لئے اور ہے خواص کے لئے اور۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ اس میں اُلی الباب کی قید سے فرق مراتب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور اسی آیت سے مخلوقات کا مرأۃ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں مقدمہ سمجھ میں آ گئے تو اب یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مامور ہیں اصلاح امت کے اور یہ کام ہو نہیں سکتا۔ تاوقتیکہ شفقت نہ ہو۔ اور شفقت کے لئے ضروری ہے۔ توجہ الی المخلوق۔ اگو اس وقت بھی توجہ الی الخالق ہوتی تھی مگر تھوڑی سی توجہ مخلوق کی طرف بھی کرنا پڑتی تھی۔ اور اس وقت مشاہدۂ حق بواسطہ مرأۃ کے ہوتا تھا۔ اسی توجہ الی المخلوق کو آپ غین یا غیم (پردہ) سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور چونکہ اس پر آپ کو طبعًا قلق ہوتا تھا اس لئے استغفار کی کثرت فرماتے تھے تاکہ اس کا تدارک ہو جاوے تو جس کیفیت کا

نام حضور کے درجہ کے اعتبار سے ذہول رکھا تھا۔ وہ توجہ الی الحق بواسطہ تھی۔ یہ حالت اگر نقص کی ہوتی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ تجویز ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کمال ہے اور انسان کے لئے اس حالت کا ہونا حکمت ہے۔ بہرحال دواماً استحضار ذکر تو کیا واجب ہوتا جو کہ فی ذاتہ مستحب ہی ہے استحضار تصدیق بھی دواماً واجب نہیں جو کہ فی ذاتہ واجب ہے۔ چنانچہ اسی لئے شریعت نے اس حالت میں فتویٰ دیا ہے کہ مومن جاگنے میں بھی مومن ہے اور سونے میں بھی مومن۔ اور حقیقت اور عقل کا فتویٰ یہ تھا۔ کہ جاگنے میں تو مومن ہے اور سونے میں کافر۔ اب دیکھی آپ نے شریعت کی رحمت (ہائے لوگ ایسی شریعت سے بھاگتے ہیں) اور آپ کو تحقیق ہو گیا کہ مثل تکوینات کے تشریعات میں بھی قدرت نے اس کی رعایت کی ہے کہ چیز جس قدر بھی زیادہ ضروری اور نافع ہوتی ہے اُسیقدر اُس میں سہولت فرما دیتے ہیں۔ اور سہولت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبادت کی حقیقت سب کے ذہن میں ہے جیسا مفصلاً بالکل شروع تمہید میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کوئی بڑا ہی امر مہم ہے پس فاعبدہ میں اسی بڑی مہم چیز کا ذکر ہے اور اصل مقصود یہی حصہ ہے باقی سیاق و سباق اسی کی تاکید و تمہید کے واسطے ہیں اور اسی آیت کے متعلق ہیں۔ اس سے پہلے بھی ایک مختصر جلسہ میں بیان کر چکا ہوں۔ جس سے آج کی تقریر گو ایک گونہ تکریر تو ہوئی مگر ہر تکریر موجب ملال نہیں ہے۔ دیکھئے دونوں ہاتھوں میں سے اگر ایک پر فالج گر جاتا ہے تو علاج کیوں کرتے ہو۔ اگر محبوب کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ پھوٹ گئی ہو تو کیوں کہتے ہو کہ حسن کم ہو گیا تو اسیطرح تکرار تلاوت یا بیان بھی موجب ملال نہ ہونا چاہیئے۔ پھر تکرار بھی من کل الوجوہ نہیں کیونکہ گو آیت تو وہی تلاوت کی ہے۔ مگر آج کے بیان میں مضامین کی جدت ضرور ہے۔ چنانچہ اس بیان سابق میں عبادت کی حقیقت اجمالاً بیان کی تھی۔ مگر تفریعات رہ گئی تھیں اس لئے آج پھر وہی آیت اختیار کی تاکہ جو مضمون اس سے متعلق رہ گیا ہے اُسے بھی بیان کر دیا جائے سو عرض کرتا ہوں۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے۔

کہ حق تعالیٰ جل علی شانہ تربیت کرنے والے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ جب یہ شان ہے کہ وہ سب کے مربی و محسن ہیں اور مَا بَیْنَہُمَا میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن سے تمہیں بھی منافع پہونچ رہے ہیں۔ تو وہ مربی ہیں تمہارے بواسطہ بھی اور بلا واسطہ بھی۔ کیونکہ جو اسباب تمہارے حدوث و بقا کے ہیں وہ اُن کے بھی مربی ہیں تو وہ اعلیٰ درجہ کے محسن ہوئے۔ تو اس شان کا مقتضا یہ ہے کہ اُن کا حق ادا کرو یعنے فَاعْبُدُہُ اُن کی عبادت کرو۔ عبادت کے معنے ہیں عبد شدن مگر بعضے محاورات جو کثیر الاستعمال ہیں اُن کے مفصل معنے کا ذہن سے اکثر ذہول ہو جاتا ہے اور وہ لفظ بھی خواپنے معنے کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ لفظ عبادت بھی ایسا ہی ہے کہ اُس کے مفصل معنے عبد شدن ہیں مگر بجائے اس معنے کے اب خود لفظ عبادت ہی ذہن میں آکر رہ جاتا ہے۔ کلام لفظی کے درجہ میں بھی دونوں درجوں میں صرف عبادت ہی آتا ہے اور اس کا دوسرا عنوان اتنا مستعمل نہیں اس لئے وہ ذہن میں نہیں آتا یعنے عبد شدن غلام ہو جانا۔ اسی عارض کے سبب حقیقت عبادت کی بہت لوگوں پر مخفی ہو گئی تو اب فاعبدہ کے معنے یہ ہوئے کہ غلام ہو جاؤ۔ یہ حاصل ہوا اس آیت کا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ امر اس درجہ تو ضروری ہے کہ حق تعالیٰ نہایت تمہید و تاکید کے ساتھ اسکا حکم فرما رہے ہیں مگر ہماری حالت کیا ہے کہ اس کی ذرا قدر نہیں اور قدر اس لئے نہیں کہ توجہ نہیں۔ شاید کوئی کہے کہ ہم عبادت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں محض اعتقاد و تلفظ کافی نہیں۔ کیونکہ جو غایت ہے ضروری سمجھنے کی جب وہ حاصل نہ ہوئی تو کیونکر معلوم ہو کہ آپ نے اس کو ضروری سمجھا مسلم ہے۔ کہ الشئی اذا خلا عن فائدۃ لغا۔ جب کوئی شئے اپنے فائدہ سے خالی سمجھی جاتی ہے تو وہ منتفی و معدوم ہو جاتی ہے۔ ضروری سمجھنا تو ایسا ہوتا ہے جس طرح تم دوا کو ضروری اور مفید سمجھتے ہو اور استعمال کرتے ہو اور قاعدہ کے موافق نسخہ بناتے ہو حکیم کے کہنے پر چلتے ہو پرہیز بھی کرتے ہو اور جب اُس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو استعمال بھی نہیں کرتے اسی طرح عبادت ہے کہ جو ضروری سمجھے گا۔ وہ اُس کو پابندی سے ادا کرے گا۔ اور قاعدہ کے

موافق ادا کرے گا اور جو اس کے ساتھ پرہیز ہیں اُنکو بھی لازم سمجھے گا۔ اگر ایسا نہ کیا تو وہ ضروری سمجھنا معتبر نہ ہوا اس پر شاید آپ اپنے دل میں خوش ہوں گے کہ ہم تو پانچوقت نماز پڑھتے ہیں اس لئے ہم تو عبادت کرتے ہیں۔ ہاں لغۃً بیشک آپ پر مصلی صادق آگیا مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ صرف عید بقر عید کی نماز پڑھ لیتے ہیں لغت کے اعتبار سے تو مصلی وہ بھی ہیں مگر اُنھیں آپ بھی نمازی نہ کہیں گے۔ کیونکہ محاورہ میں نمازی اُس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہوں۔ اگر کسی نے ایک دن باپ کی اطاعت کی اور حاکم تعظیم کی اور ایک دن نہ کی تو کیا اُسے مؤدب و مہذب کہیں گے۔ لغۃً تو کہیں گے۔ مگر محاورہ میں نہیں کہیں گے کیونکہ اس محاورہ میں لغت سے کچھ اضافہ ہے۔ ادب کرنے والا محاورہ میں اُس کو نہیں کہیں گے جو ایک دن کرے اور ایک دن نہ کرے۔ اسیطرح قرآن و حدیث بھی محاورات میں ہے۔ تو شرعًا عابد اسیکو کہیں گے جو دوام کرے۔ غلامی پر دیکھئے اگر کوئی غلام ایسا کرے کہ کھانا تو آقا کے سامنے لاکر رکھدے اور پانی مانگنے کے وقت انکار کردے کہ پانی تو میں نہیں لاؤں گا۔ اُسے آپ فرماں بردار کہیں گے۔ یا سرکش یقینًا سرکش کہیں گے۔ اسی طرح ننانوے حکم آقا کے مانے اور صرف ایک نہ مانے تب بھی وہ سرکش ہی کہلائے گا۔ چہ جائیکہ ہماری طرح کہ ایک ملنے اور ننانوے نہ مانے اگر کوئی کہے کہ ہم تو خدا کے احکام مانتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تمام اوامر و نواہی میں اپنی حالت جانچ لیں کہ کُل کو مانتے ہیں یا نہیں جانچنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ واقع میں تم اپنے کو محض زبان سے غلام بتلاتے ہو مگر حقیقت بھی غلامی کی نہیں سمجھتے بس وہی حالت ہے کہ ہجے تو کریں گے تے بے زبر تب اور بے تے زیر بت اور روان کہیں گے بطخ کہ ہجے میں تو ہم غلام بنتے ہیں۔ اور جب غلامی کرنے کا وقت آتا ہے تو بطخ بن جاتے ہیں ارے بھائی یہ تو تبت ہوا تھا بطخ کہاں سے ہوا۔ یاد رکھو غلام تو وہی ہے کہ جو بغیر اگر مگر کے ہر امر میں آقا کی اطاعت کرے اس معیار کو سمجھکر دیکھئے کیا آپ واقعی غلام ہیں تو بہت سے تو ایسے نکلیں گے جو عبادت کرتے ہی نہیں اور بعضے کرتے ہیں تو پابندی سے نہیں کرتے اور جو پابندی بھی کرتے ہیں وہ ضابطہ سے نہیں کرتے ہیں یونہی بے ڈھنگی ادا کرتے ہیں اور بعضے

وہ ہیں جو احکام الٰہیہ میں شبہات نکالتے ہیں۔ صاحبو کیا اسی کا نام غلامی ہے۔ ہرگز نہیں یہ تو غلامی کا دعویٰ ہے حقیقت غلامی نہیں۔ اور ضرورت اس کی ہے اور رگو اس کا اہتمام فرداً فرداً ہر شخص پر فرض ہے مگر اس کے اہتمام و انتظام میں جن جماعتوں کا زیادہ دخل ہے وہ دو گروہ ہیں جو مخلوق کو خدا کا حقیقی غلام بنا کے اطاعت کرا سکتے ہیں اُس میں ایک تو علماء کا گروہ ہے انکا بڑا اثر ہوتا ہے اگر یہ خدانخواستہ گمراہ ہوں تو سارے عالم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ زلۃ العالم زلۃ العالم۔ اور دوسرا امراء کا ہے علماء کا عوام پر دینی اثر ہے اور امراء کا دنیوی۔ علماء کا دینی اثر تو یہ ہے کہ اُن کی اعتقادی و جاہت ہے اور اُن کے احکام کی قلب میں قدر و وقعت ہے۔ وہ عوام کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو اُس سے کچھ آخرت کے اجر کی طمع اور کچھ وہاں کے عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور امراء کے احکام کا اثر اُن کے دنیوی اقتدار کے خوف یا طمع سے ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ خوف بھی ہے اور طمع بھی۔ ایک جگہ آخرت کا ایک جگہ دنیا کا۔ بس یہ دو گروہ تھے جو خود غلام بن کے اپنا نمونہ پیش کرتے تو پھر عوام بھی اُنکے ساتھ ہوتے اور اب تو ایک تیسرا فرقہ خواہ مخواہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ فرقہ کون ہے وہ صوفیۂ کرام کا گروہ ہے۔ حالانکہ یہ کوئی بنا گروہ نہیں تھا۔ بلکہ حقیقت میں یہ وہی علماء ہیں مگر علماء نے ایک کام چھوڑ دیا۔ اس وجہ سے یہ تیسرا گروہ پیدا ہو گیا۔ وہ کام کیا ہے۔ مجاہدہ و ریاضت کیونکہ ذرا یہ کام ہے مشکل کہ کھانا چھوڑ دو۔ لوگوں سے ملو جلو نہیں۔ اچھا کپڑا مت پہنو۔ ٹھنڈا پانی مت پیو۔ اور چند روز سے صوفیت کی یہی تعریف رہ گئی ہے۔ تو جن لوگوں نے اس کو اختیار کر لیا وہ صوفی کہلانے لگے۔ خواہ اُن کو نہ علم ہو نہ عمل تو اس طرح سے یہ تیسرا فرقہ ہو گیا۔ حالانکہ صوفیت واقع میں اور ہی چیز ہے جسے ان باتوں سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اور یہ بھی تصوف کی تعریف کچھ دنوں پہلے تک تھی۔ اور اب تو اس سے بھی سہل صوفیت نکلی ہے کہ کپڑے رنگ لئے۔ بال بڑھا لئے تسبیح پڑھ لی۔ تھوڑا سا ذکر کر لیا۔ بس لوگ معتقد ہو گئے۔ اور وہ گناہ بھی کریں تو بھی بزرگی نہیں ڈھلتی۔ بس ہیں یہ بڑے مزہ میں نہ بولے تو چپ شاہ

اور اگر بولے اور بے ڈھنگی بولے تو صاحب رموز ہیں۔ اور ڈھنگ کی بولے تو عارف ہیں۔ خرابی تو بے چارے مولوی کی ہے کہ کہیں ایک بھی مسئلہ غلط کہا تو قلعی کھلگئی۔ اور صوفی صاحب کیسی ہی غلطیاں کریں مگر وہ صاحب رموز ہیں۔ پھر اوپر سے معتقدین کا ہر بات میں حضور حضور کرنا طرہ بردستار ہوگیا یہ اُنھیں اور زیادہ خراب کرتے ہیں جیسے ایک امیر تھے وہ جھوٹ بہت بولا کرتے تھے۔ اور اُن کا ایک مصاحب اُن کے جھوٹ کی توجیہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اُنھوں نے بیان کیا کہ میں شکار کو گیا ایک ہرن پر جو گولی چلائی تو سُم کو توڑ کے ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کہاں سُم کہاں ماتھا۔ مصاحب نے فوراً توجیہ کی کہ ہاں حضور اُس وقت وہ کھجلا رہا تھا۔ امراء کے یہاں تو رات دن ایسے خوشامدی مصاحب رہتے ہی ہیں۔ مگر مشائخ کے یہاں بھی اب ایسے ہی معتقد رہ گئے ہیں کہ خواہ مخواہ رات دن اُن کی کرامتوں کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور اُن کے عیب کو ہنر بتلاتے ہیں۔ تو بہر حال علماء میں سے ایک شاخ نکل کر فقراء بن گئی۔ مگر واقع میں صوفیہ علماء ہی ہیں۔ اور جو جاہل ہو وہ صوفی ہی نہیں۔ اور احادیث میں جن علماء کی فضیلت آئی ہے وہ واقع میں وہی علماء ہیں جو صوفی بھی ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وہی القلب۔ یعنے جسم انسانی میں ایک پارۂ گوشت ہے۔ جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ خبردار رہو وہ قلب ہے تو جس نے اپنے قلب کی اصلاح نہ کی ہو اور اس لئے اُس کی تمام عملی حالت تباہ ہو۔ وہ کیونکر عالم مورد فضائل وارد کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ بہر حال علماء وہی ہیں جو صوفیہ ہیں اور جن علماء کے فضائل نصوص میں وارد ہیں وہی علماء ہیں جو درویش بھی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنے خوف وخشیت خدا سے صرف علماء ہی کو حاصل ہے۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ مراد ہیں کیونکہ خشیت کا ملہ اُن ہی میں ہے

اسی طرح علماء کو ورثۃ الانبیاء کہا گیا ہے۔ اس بنا پر کہ انبیاء نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ زراعت نہ تجارت اُنھوں نے صرف علم چھوڑا تو جن کے پاس یہ علم موروث انبیاء ہوگا وہی لقب عالم کا مستحق ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کا علم یہ علم رسمی نہ تھا علم حقیقی و قلبی تھا جس کی شان یہ ہے۔ ؎

علم چوں بر تن زنی مارے شود　　علم چوں بر دل زنی یارے شود

دوسرے محقق کہتے ہیں ؎

علم رسمی سر بسر قیل ست و قال　　نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال
علم چہ بود آنکہ رہ بنما یدت　　زنگ گمراہی ز دل بز دایدت
ایں ہوسہا از سرت بیروں کند　　خوف و خشیت در دلت افزوں کند

اور ہماری حالت کیا ہے اُسے بھی بیان کرتے ہیں۔ ؎

تو ندانی جز یجوز و لا یجوز　　خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز
ایہا القوم الذی فی المدرسہ　　کلما حصلتموہ وسوسہ
علم نبود غیر علم عاشقی　　ما بقی تلبیس ابلیس شقی

تو حضرت وہ علم جو انبیاء نے چھوڑا وہ یہ ہے جس کے خواص آپ نے سُنے اور جو اس ... علم کے حامل ہیں وہ ہیں نائب رسول اور ورثۃ الانبیاء تو حقیقت میں درویش بھی علماء ہوئے۔ غرض دو طبقے ایسے ثابت ہوئے جنکی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ کیونکہ ان کا اثر سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے اگر یہ گمراہ ہوں گے تو سب کو گمراہ کریں گے سو افسوس یہ ہے کہ عبادت کے متعلق یہ طبقے بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں تو عوام کیونکر غلطیوں سے بچتے۔ چنانچہ منجملہ اُن کی غلطیوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عبادت کے معنے صحیح نہیں سمجھے۔ عوام کی تو غلطی یہ تھی کہ وہ عبادت کے معنے غلط سمجھتے ہیں کہ صرف نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ خاص اعمال .... میں منحصر سمجھتے ہیں۔ اس لئے دوسرے اعمال میں کوتاہی کرتا عجیب نہیں کہ وہ اُنکو عبادت ہی نہیں سمجھتے مگر لکھے پڑھوں کی غلطی نہایت سخت ہے کہ وہ عبادت کے معنے

بھی جانتے ہیں کہ اطاعت مطلقہ ہیں۔ پھر اس میں غلطی کرتے ہیں کہ اُس کے محل سے ناواقف ہیں یا بے پروا ہیں۔ اور یہی مراد ہے صحیح معنے نہ سمجھنے سے۔ یعنے معنی تو سمجھے مگر صحیح نہیں سمجھے اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ اس جلسہ میں جس میں زیادہ تر طلبہ موجود ہیں عرض کروں کہ اطاعت مطلقہ کے محل کیا کیا ہیں۔ سو سنئے کہ سب سے اول محل تو عقائد ہیں یعنے جس طرح شریعت نے عقائد سکھلائے ہیں اُسی کیموافق اعتقاد رکھیں۔ دوسرا محل اعمال دیانات ہیں۔ نماز روزہ حج زکوۃ وغیرہ انھیں بھی شریعت کیموافق پابندی سے صحیح طور پر ادا کریں۔ تیسرا محل معاملات ہیں بیع وشراء وغیرہ کہ اُن کو بھی احکام شرع کے مطابق کریں۔ اور یہ معلوم کریں کہ کونسی بیع فاسد ہے اور کونسی باطل کونسا معاملہ صحیح ہے اور کونسا فاسد۔ کس معاملہ میں ربوا لازم آتا ہے اور کس میں قمار۔ یہ سب شریعت سے معلوم کرکے اُسی کے موافق کیا کریں چوتھا محل معاشرت ہے کہ اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا ملنا جلنا اس کو معلوم کریں کہ اس کے شریعت میں کیا آداب ہیں۔ پانچواں محل اخلاق ہیں۔ اخلاق کے یہ معنے نہیں کہ نرمی سے بول لئے یا تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے یا ادب سے سلام کر لیا۔ یہ تو آثار ہیں اخلاق کے۔ خود اخلاق نہیں۔ اخلاق یہ ہیں۔ تواضع۔ صبر شکر۔ زہد و قناعت شوق و رضا وغیرہ یہ ہیں اخلاق یعنے اعمال باطنی۔ ان کے مقابلہ میں ان کے اضداد ہیں۔ کبر۔ بے صبری ناشکری۔ طمع و حرص۔ حسد۔ بغض۔ کینہ۔ یہ اخلاق ذمیمہ ہیں۔ تو اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عبادت کیا ہے۔ عبادت ان تمام شعبوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اب اس میں غلطی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعضے یہی نہیں جانتے کہ ان پانچ میں اصل کیا ہے۔ اسی لئے بعض لوگ تصحیح عقائد کی فکر نہیں کرتے۔ گو کسیقدر اعمال کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور بعضے یہ تو جانتے ہیں کہ ان میں اصل عقیدہ ہے۔ یہی راس العبادات اور اساس العبادات ہے۔ کہ بغیر اس کے کچھ بھی صحیح نہیں۔ مگر اُن سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ جب اسے بڑا سمجھ لیا۔ تو اُن کے نفس نے یہ کہا۔ کہ بڑے کے سامنے چھوٹے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ننانوے کے ہوتے ایک کی کمی چنداں مضر نہیں۔ تو اُن کی نظر سے

اعمال کا اہتمام جاتا رہا۔ چنانچہ بہت لوگ جو عقائد حقہ رکھنے والے ہیں۔ اور اُن کے اعمال بھی درست ہیں۔ وہ اگر کسی کے عقائد درست دیکھتے ہیں۔ گو اعمال درست نہ ہوں تو تسامح کرتے ہیں اور اُس سے نفرت نہیں کرتے یعنے اتنی نفرت بھی نہیں کرتے جتنی شرعاً کرنی چاہیئے۔ بلکہ تعریف کے طور پر کہدیتے ہیں کہ فلانکے عقائد بہت اچھے ہیں گو وہ رشوت بھی لیتا ہو ظلم بھی کرتا ہو نماز بھی نہ ہو۔ مگر عقائد صحیح ہونے کی وجہ سے اُس کی کسی بات سے نفرت نہیں۔ مثلاً کوئی نماز نہ پڑھے تو اُس سے اُنھیں نفرت نہیں حالانکہ من ترک الصلاۃ متعمداً فقد کفر۔ میں فقد کفر نفرت ہی کی تو دلیل ہے کہ شریعت نے تارک صلوۃ کو مثل کافر کے اسی لئے تو فرمایا تاکہ مصلین ترک صلوۃ نہ کریں۔ اور تارک صلوۃ غازی بنجاوے۔ اور تارک صلوۃ کو بھی اپنی حالت سے نفرت ہو اور نماز شروع کردے مصلی اُس سے نفرت ظاہر کرے تعلق قطع کرے اور خلا ملا نہ رکھے مگر ساتھ ہی اپنے کو مقدس اور اُس کو حقیر نہ سمجھے۔ یہاں تو قدم قدم پر لغزشیں اور رہزن موجود ہیں۔ یا تو بے غازی سے نفرت نہ کریں گے۔ یا کریں گے تو اپنے کو مقدس سمجھیں گے جو کہ کبر ہے جو کہ ترک غاز سے بھی قبیح ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ بے غازی کو سلام کرنا کیسا ہے۔ اور سوال کیا تحقیر کے لہجہ میں مجھے لب و لہجہ سے معلوم گیا کہ منشاء اس سوال کا کبر ہے اگر مجھ سے پوچھتے کہ اس کی دلیل کیا تو یہ میں نہیں بتا سکتا تھا۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے نبض دیکھکر طبیب کہتا ہے کہ تم کو پرانا بخار ہے اب تم عطائی ہو۔ وہ تمھیں کیونکر سمجھائے اسیطرح میں دلیل نہیں بتا سکتا۔ لیکن ہاں حق تعالےٰ کی یہ ایک نعمت ہے کہ مجھے لب و لہجہ سے اکثر قلبی حالت کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ فیض ہے محبت سنت کا حق تعالےٰ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں۔ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ط حُب سنت سے ایسا فہم حاصل ہو جاتا ہے اس کا کوئی قاعدہ کلیہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے لئے کوئی دلیل بیان کی جائے گی تو اُس کی وہ گت ہوگی۔ جیسے ایک طبیب کے صاحبزادے تھے اناڑی اُن کے باپ کسی مریض کو دیکھنے گئے۔ اُنھیں بھی ساتھ لیگئے

جاکے مریض کی نبض دیکھی تو نبض سے اتنا معلوم ہوا کہ کوئی بدپرہیزی ہوئی ہے۔ اتفاق سے وہاں چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے بھی پڑے تھے۔ تو طبیب نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے نارنگی کھائی ہے۔ واقعی مریض نے نارنگی کھائی تھی۔ اب صاحبزادہ نے ایک قاعدہ کلیہ اخذ کیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہو۔ وہ ضرور مریض کی کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اتفاق سے وہ طبیب مرگئے۔ اب صاحبزادے اُن کے قائم مقام ہوئے ایک مریض کو دیکھنے گئے اُس کی چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا تھا۔ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے۔ اُس نے کہا واہ صاحب کہیں نمدہ بھی کھایا جاتا ہے۔ کہنے لگے صاحب نبض سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ مریض نے کہا نکالو۔ اس کو اُس کی دم میں نمدہ۔ تو جس طرح بخار پہچاننے کے لئے محض سرعت نبض کافی نہیں۔ بلکہ ایک ذوق کی ضرورت ہے جس سے طبیب کو پتہ چل جاتا ہے۔ اسیطرح لب و لہجہ سے پہچان لینا یہ بھی ذوقی امر ہے۔ اور یہ کوئی بزرگی کی دلیل نہیں ہے۔ یہ تو مناسبت سے حاصل ہو جاتا ہے جو خدمت خلائق کے کام کرنے والے کو حق تعالےٰ عطا فرما دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ اس سوال کا سبب کبر ہے۔ اس لئے میں نے کہا کہ تمہارے واسطے تو یہی ضروری ہے کہ فاسق کو ابتداءً سلام کیا کرو۔ غرض نفرت کی بھی قسمیں ہیں۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ کبھی متکبر بن کو سند مل جائے۔ چنانچہ جنہیں نفوے کا ہیضہ ہوتا ہے وہ خدا جانے مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں یاد رکھو اہل معاصی سے نفرت کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے اور تکبر کرے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تو سب سے کم سمجھے اور پھر شریعت کے حکم کی وجہ سے نفرت کرے۔ اور یہاں بڑا زبردست اشکال ہے وہ یہ کہ تواضع کا اقتضاء یہ ہے کہ کسی سے بھی نفرت نہ کرے۔ اور بغض فی اللہ کا مقتضا یہ ہے کہ عاصی سے نفرت کرے اور نفرت جب کرے گا تو ضرور اُسے کمتر سمجھے گا۔ اور جب اُسے معصیت کے سبب کمتر سمجھے گا۔ تو پھر اپنے کو کہ معصیت سے محفوظ ہے اُس سے کیسے کمتر سمجھے گا۔ اسی واسطے کسی غیر محقق نے تنگ ہو کر کہہ دیا ہے۔ ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ۔ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

مگر محقق دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیتا ہے کہ دریا میں بھی جائے اور خشک دامن بھی رہے اُس کو ایسا تیرنا آتا ہے کہ کھڑا ہو کر تیرتا ہے اُس کی حقیقت نہایت ہی آسان ہے محققین نے اُس کو بھی حل کر دیا ہے۔ ایک مثال اُس کے لئے کافی ہے کہ مثلاً بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ شہزادے نے فلاں جرم کیا ہے اس کو ایک درجن بید لگاؤ۔ اب یہاں دو حکم ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ شہزادہ ہے۔ اسے عظیم الشان سمجھو اور دوسرا یہ کہ اُس نے ایک قصور کیا ہے اس لئے مجرم بھی سمجھو۔ اب وہ بھنگی جانتا ہے کہ یہ سزا کے قابل ہے۔ اور میں سزا کے قابل نہیں۔ اس حیثیت سے میں افضل ہوں مگر باوجود اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں بھنگی ہوں۔ اس لئے باوجود مجرم ہونے کے بھی یہ مجھ سے بدرجہا افضل ہے۔ دیکھئے دونوں امر کس طرح جمع ہو گئے وہ بھنگی بادشاہ کے امتثال کے لئے تو مارتا ہے۔ اور اپنے اعتقاد سے تعظیم کرتا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی۔ تو اب یہ سمجھو کہ جب تم کسی مسلمان سے معصیت کی وجہ سے نفرت کرو تو اس کی ساتھ یہ بھی سمجھو کہ ممکن ہے کہ عند اللہ اس کا رتبہ مجھ سے اس لئے بڑھا ہوا ہو کہ اس میں کوئی دوسرا کمال ایسا ہو جو مجھ میں نہ ہو۔ مگر اس حیثیت سے کہ یہ بے نمازی ہے حکم شاہی ہے کہ بے نمازی کو سلام نہ کرو۔ اس واسطے میں سلام نہیں کرتا۔ باقی میں اس سے افضل نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ کسی مخفی عمل کی بدولت یہ عند اللہ مجھ سے افضل ہو۔ کیونکہ اعمال کا انحصار نماز ہی میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ توحید اُس کی اتنی خالص ہو کہ بلا محاسبہ بخشا جائے تو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ عند اللہ بھی میں اُس سے افضل ہوں۔ اور وہ تو پھر مسلمان ہے۔ محققین تو کفار کے بارہ میں بھی یہ خیال رکھتے ہیں۔ ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید ۔ کہ مسلماں بودنش باشد امید

ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے۔ تو پھر کیا خبر ہے کہ وہ افضل ہوگا یا آپ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے۔ میں نے کہا اُس شخص کو

جائز ہے جسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا خاتمہ یزید سے اچھا ہو گا۔ ارے اپنے کام میں لگو لعنت کا وظیفہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت رابعہ سے کسی نے پوچھا تم ابلیس پر لعنت نہیں کرتیں۔ کہنے لگیں جتنی دیر میں اُس پر لعنت کروں۔ میں اپنے محبوب کی یاد ہی نہ کروں۔ لعنت کے باب میں بعضوں کا دوسرا مذاق بھی ہے۔ ایک شخص تھا وہ روز ایک ہزار مرتبہ شیطان پر لعنت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اُس دشمن نے بھی کیسا بدلا لیا کہ دیوار کے نیچے سو رہا تھا اُس نے آکر جگا دیا کہ اُٹھو اُٹھو بھاگو یہ جیسے ہی وہاں ہٹا دیوار گر پڑی یہ بہت خوش ہوا کہ یہ تو کوئی بڑا خیر خواہ ہے۔ پوچھا تم کون ہو۔ کہا نام نہ پوچھو نام سنکر تم خوش نہ ہو گے۔ کہا صاحب بتلاؤ بھی۔ کہا میں وہی شیطان ہوں جس پر تم ہزار مرتبہ روزانہ لعنت بھیجا کرتے ہو۔ کہا تم تو میرے بڑے خیر خواہ نکلے۔ اُس نے کہا کہ میں نے خیر خواہی سے نہیں بچایا۔ بلکہ اس خیال سے بچایا کہ دیوار کے نیچے دبکے مرو گے تو شہید ہو جاؤ گے اور بے حساب بخشے جاؤ گے۔ تو مجھے فکر ہوئی کہ کسی طرح اتنے بڑے ثواب سے محروم کردوں۔ دوسرے اگر جیتا رہے گا تو تجھپر خوب مشق کیا کرونگا ابھی بہت دن نچاؤں گا جیسے بندر ریچھ کہ اگر مر جاوے تو بندر والا پھر کہاں سے کمائیگا بہرحال کسی پر لعنت کرنا فضول حرکت ہے۔ جب کہ اپنے ہی حال کی خبر نہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما　　گہ خندہ زند دیو ز ناپاکی ما
ایمان چو سلامت بلب گور بریم　　احسنت بریں چستی و چالاکی ما

جب خاتمہ ہو گا اُس وقت معلوم ہو گا کہ کس حالت میں گئے۔ بس تو پھر کیا منہ لیکے کسیکو کہیں جس پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو وہ میونسپلٹی کے چار آنہ آٹھ آنہ والے جرمانہ کے مجرم پر ہنسے تو کیا یہ حماقت ہی نہیں۔ اور جب یزید و ابلیس پر بھی لعنت کرنا فضول یا خطرناک ہے، تو مسلمان کی غیبت کیا کچھ ہوگی اور آجکل تو اس سے بڑھکر یہ تماشا ہے کہ غیبت کے لئے بھی علماء و اتقیا ہی تجویز کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ کی مجلسوں میں اکثر دوسرے مشائخ و علماء کی ہی غیبتیں ہوا کرتی ہیں جہاں فساق کی بھی پردہ دری

جائز نہیں تھی۔ غرض کسیکو حقیر مت سمجھو۔ ابھی تمھاری ہی کشتی نجد ہار ہیں ہے۔ البتہ جہاں شریعت اجازت دے وہ مواقع مستثنٰے ہیں۔ باقی جہاں اجازت نہیں وہاں غیبت کرنا خصوص سب کام چھوڑکے اسی کا شغل کرلینا۔ میں اس کو منع کر رہا ہوں بالخصوص جبکہ نہ اپنا انجام معلوم ہو۔ نہ اُس کا جس کی غیبت کر رہے ہو اسی پر کسی نے تنبیہ کیا ہے۔ ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را | در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش | ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

تو جنکے لئے ترک سلام کا حکم ہے وہاں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترک اس حیثیت سے کہ ہم اس سے افضل ہیں۔ یہ تو ممنوع ہے۔ اور ایک اس حیثیت سے کہ یہ حکم شرع ہے۔ یہ مطلوب و مامور بہ ہے اور وہ بھی وہاں جہاں ترک میں مصلحت ہو ورنہ جہاں مفسدہ کا احتمال ہو وہاں جائز نہیں۔ مثلاً یہ اندیشہ ہو کہ اس سے اور ضد بڑھ جاوے گی۔ اور اس شخص کا دین اور تباہ ہو گا۔ اسیواسطے تو دین میں ہر جگہ تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہر کام میں کسی محقق کو اپنا رہبر بناؤ اور اُس سے ایک ایک جزئی پوچھو۔ البتہ اُس کے انتخاب میں بڑے غور و خوض کی ضرورت ہو گی اب اول تو انتخاب ہی میں غلطی ہوتی ہے۔ اور اگر انتخاب بھی صحیح ہوا تو اتخاذ شیخ اس واسطے کہتے ہیں کہ اُن سے مقدمات میں دعا کرایا کریں گے۔ تعویذ گنڈے کرایا کریں گے۔ گویا شیخ ان کے نوکر ہیں ششماہی نذرانہ تنخواہ میں پاتے ہیں۔ اور اگر زیادہ خوش اعتقاد ہوئے تو اس خیال سے پیر بناتے ہیں کہ بس وہ خدا کے ہاں بخشا لیں گے۔ چاہے وہ خود بھی نہ بخشے جائیں۔ حضرت شیخ ان کاموں کے لئے نہیں ہے۔ وہ تو طبیب ہی اُن کے سامنے اپنے امراض ظاہر کرو اور اُن سے اپنی حالت کا فیصلہ کراؤ اور جو وہ علاج بتائیں اُس پر عمل کرو۔ جب ایسا انتظام ہو گا تو حضرت اس بارہ میں بھی شیخ ہی کے مشورہ پر عمل ہو گا۔ کہ کہاں سلام کریں اور کہاں کریں۔ کہاں مصلحت ہے اور کہاں مفسدہ۔ ؎

یار باید راہ را تنہا مرو   بے قلاؤز اندریں صحرا مرو

اور اگر کسی کے پاس رہبر محقق نہیں ہے تو وہ اگر دین پر عمل کرنا چاہیگا تو صورت دین پر عمل کرنا آجائے گا۔ مگر حقیقت دین پر عمل کرنا مشکل ہوگا کیونکہ صورت میں بہت چیزیں متشابہ ہیں جو واقع میں اضداد ہیں۔ ؎

گر چنیں بنماید و گہ ضد ایں   جز کہ حیرانی نباشد کار دین

یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ معاصی پر گرانی ہونا ضروری ہے لیکن حدود و قیود کی رعایت سے۔ مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اہل حق نے اعمال کو عقائد پر اکتفا کر کے اتنا ترک کر دیا ہے کہ کسی کے ترک اعمال سے گرانی بھی نہیں ہوتی۔ اور جو مبتلا ہے وہ تو کیوں گراں سمجھتا۔ بس یہ حالت ہے کہ جو جس میں مبتلا ہے۔ اُسے گراں نہیں سمجھتا۔ بے نمازی نماز نہ پڑھنے کو گراں نہیں سمجھتا۔ اور جو نمازی ہے مگر دوسری آفتوں میں مبتلا ہے وہ اُنھیں گراں نہیں سمجھتا۔ مثلاً امارد و نساء پر نظر کیا کرتا ہے اور اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ اور یہ گناہ گو ہے تو صغیرہ مگر بعض اوقات صغیرہ میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں کہ وہ ان مفاسد میں کبیرہ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ گناہ میں دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک امتداد اور ایک اشتداد سو کبیرہ میں جو سختی ہے وہ اشتداد کی وجہ سے ہے اور جس گناہ میں اشتداد کم ہے وہ صغیرہ ہے۔ مگر گناہ میں ایک درجہ ہے امتداد کا۔ اور یہ اکثر صغیرہ ہی میں زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اشتداد کا تدارک اکثر اس لئے آسان ہے کہ اُس کا معصیت ہونا بین ہے اس لئے ڈر کر ایک مرتبہ دل سے اللّٰھم اغفرلی کہہ لیا گویا پہاڑ کو بارود سے توڑ دیا۔ لیکن امتداد کا تدارک اس لئے مشکل ہے کہ اُس کو سرسری سمجھکر کرتا رہتا ہے اور اس عادت کے سبب اُسکا اثر راسخ ہوتا رہتا ہے پھر توبہ کا عزم سست ہو جاتا ہے۔ مثلاً بد نگاہی کو لیجئے کہ اُس میں گو اشتداد نہیں مگر امتداد کبیرہ سے بڑھکر ہے۔ سرسری سمجھنے سے بھی اور خود اُس کی خصوصیت سے بھی۔ چنانچہ مشاہد ہے کہ نماز نہ پڑھنے سے کوئی ایسا اثر قلب میں نہیں ہوتا جس سے نجات نہ ہو سکے۔ مگر نگاہ بد کے اثر سے بعض اوقات

عمر بھی بجات مشکل ہو جاتی ہے اس کی تو وہ شان ہو جاتی ہے۔ ؎

درون سینہ من زخم بے نشان زدہ — بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدہ

چنانچہ ہزاروں قصے ہیں کہ بس ایک دفعہ نگاہ پڑ گئی۔ اور عمر بھر کو بے چینی لگ گئی کیونکہ محبوب کے نہ محلہ کی خبر نہ کچھ پتہ۔ اب فکر ہے کہ دوبارہ کہاں دیکھ لیں اب گھل رہے ہیں۔ یا مثلاً پردہ دار ہے اور وہ فوراً چھپ گئی۔ تو اُسے پھر کیونکر دیکھیں۔ اب اُس نے اس پر ایک اور غضب یہ کیا۔ کہ اُس خیال کو اپنے دل میں پالا اُسے جمایا کہ بت پرست کی طرح سوچنا رہا کہ ہائے اُس کا ایسا رخسارہ ہے اور ایسی ادا۔ اور ایسی زلف۔ جب وہ اچھی طرح دل میں جم گیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ نہ ملامت نافع ہے نہ خوف نہ حیا نہ شرم۔ کما قیل۔ ؎

عذل العواذل حول قلبی التائہ — وہوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

اب مرض بڑھا کہ نہ نماز میں جی لگتا ہے۔ نہ روزہ میں۔ نہ اللہ یاد رہا نہ رسول بس ہر وقت وہی مر دا ہے۔ حتے کہ اب نماز روزہ بھی ترک ہونے لگا۔ اعمال پر اثر پڑا پھر صحت پر اثر پڑا اور بیمار پڑ گیا۔ اور بیماری بھی اتنی بڑھی کہ حالت مایوسی کی ہو گئی۔ غرض ایمان اور جان سب اُسکی نذر ہو گیا۔ یہ سب خرابی اسی نگاہ بد منحوس کی بدولت ہوئی مگر اس میں اُسے وہ لذت ہے کہ ترک کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا جیسے خارش والے کو کہ کھجلانے سے خارش بڑھتی ہے مگر اس میں وہ مزہ ہے جیسی شاعر نے کہا ہے۔ ؎

لڈو میں نہ برفی میں نہ پیڑے میں مزا ہے — جو حضرت کھجلی کے کھجانے میں مزا ہی

مگر کسی مبتلا کو اب بھی مایوس نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ مرض بھی گو سخت ہے۔ مگر لاعلاج نہیں۔ ماجعل اللہ داء۔ الا وقد جعل لہ دواء۔ خدا نے کوئی مرض ایسا نہیں بنایا جس کا علاج نہ ہو۔ چنانچہ اس عشق مجازی کی بھی دوا ہے اگر کوئی کرنا ہی نہ چاہے تو اور بات ہے جیسے مجنوں کہ وہ اپنی محبت کو خود زائل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس کے باپ نے اُس سے کہا کہ خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کے دُعا کرو

اللھم ازل عنی حب لیلی (اے اللہ مجھ سے لیلیٰ کی محبت دور کردے) تو آپ فرماتے ہیں اللھم زدنی حب لیلی۔ (اے اللہ مجھ میں لیلے کی محبت بڑھادے) اور فی البدیہ یہ شعر پڑھا۔ ؎

الٰہی تبت من کل المعاصی ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

(یعنے اے اللہ میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔ مگر لیلے کی محبت سے توبہ نہیں کرتا) گو وہ فاسق نہ تھا پاک عاشق تھا۔ اور اپنے عشق میں اتنا کامل ہوگیا تھا کہ اُسے بجائے محبوب کے خود محبت ہی مقصود ہوگئی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ لیلےٰ خود اُس کے پاس پہونچ گئی پوچھا من انت تو کون ہے۔ اُس نے کہا انا لیلےٰ۔ میں لیلی ہوں کہا الیک عنی فان حبک شغلنی عنک۔ ہٹ مجھے تیری محبت نے تجھ سے بھی بے نیاز کردیا تو یہ عشق تھا اور ابتو سراسر فسق ہوتا ہے۔ ؎

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود ایں فساد خوردن گندم بود

سو مجنوں نے علاج نہ چاہا مبتلائے مصیبت رہا لیکن وہ فاسق نہ تھا اس لئے علاج نہ کرنا صرف اُس کی جان ہی تک مضر رہا۔ اور ابتو فسق کے سبب ایمان کی بھی خیر نہیں۔ اس لئے علاج کی سخت ضرورت ہے ور نہ یاد رکھو کہ اگر یہ عشق ختم نہ ہوا تو عجب نہیں اعمال و ایمان ہی ختم ہو جائیں۔ چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے آدمی تھے وہ ایک یہودن پر عاشق ہوئے۔ میں اُن کے بڑھاپے کی وجہ سے اُن کا ادب باپ کا سا کرتا تھا۔ اور وہ طالب علم سمجھکر میرا ادب کرتے تھے۔ مگر اُس چہا سوز عشق میں یہاں تک نوبت پہونچی کہ وہ سب ادب وحیا کو بالائے طاق رکھکر ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ کہ اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں۔ اگر وہ عیسائی ہے تو میں عیسائی ہوں۔ نعوذ باللہ وہ تھے تہجد گذار۔ مگر دیکھئے ایک بدنگاہی سے سب ختم ہوگیا۔ اسلئے میں کہتا ہوں کہ اس سے بہت بچنا چاہئے۔ ابن القیم نے دوا الکافی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک نہایت حسین عورت نے ایک آدمی سے حمام منجانب کا راستہ پوچھا کچھ نظر اور کچھ اُس کی باتوں سے اور کچھ اُس کی صورت سے یہ گرویدہ ہوگیا۔ اور

اُسے دھوکہ دیا کہ اپنے ہی مکان کو حمام منجاب بتادیا۔ جب وہ مکان میں گئی یہ بھی اندر گھس گیا۔ وہ تھی عفیفہ اُس کی بدنیتی کو سمجھ گئی۔ اُس نے کہا کہ میں تو خود تجھپر فریفتہ ہوں مگر اس وقت میں بہت بھوکی ہوں۔ پہلے میرے لئے کچھ کھانے کو لاؤ۔ آپ بازار میں گئے۔ جب اُس نے گھر اکیلا پایا تو چپکے نکلکے چلدی اب جو کھانا لیکر آیا اور اُسے نہ پایا تو مارے غم کے بیمار پڑگیا۔ اور یہانتک کہ وقت اخیر آگیا لوگوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو تو یہ بجائے اس کے کہتا ہے۔ ؎

یا رب سائلۃ یوماً وقد تعبت　　　این الطریق الی حمام منجاب

اور اسی پر خاتمہ ہوگیا۔ اُنھوں نے ایک اور حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا اُس کے فراق میں بیمار ہوگیا۔ کسی نے اُس لڑکے کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے چلے جانے سے اُسے افاقہ ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہوگیا۔ اُس کو بھی کسی نے خبر دیدی کہ وہ لڑکا آرہا ہے یہ مارے خوشی کے اٹھ بیٹھا۔ پھر وہ راستہ ہی سے لوٹ گیا کہ جانے میں رسوائی ہے اس کی بھی اُسے کسی نے خبر دیدی وہ پھر گر پڑا۔ اور یہ شعر پڑھنے لگا۔ ؎

رضاک اشھی الی فوادی　　　من رحمۃ الخالق الجلیل

بس اسی پر دم نکل گیا۔ ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص شہوات و معاصی میں منہمک تھا۔ اُس سے اخیر وقت میں کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو کہتا ہے۔ کہ اتنے معاصی کے ہوتے ہوئے کلمہ ہی سے کیا ہوگا اور اسی پر دم نکل گیا۔ کمبخت معاصی میں یہ بھی خاصیت ہے کہ رحمت خداوندی سے مایوس کردیتی ہے۔ تب ہی تو کلمہ سے انکار کیا اور اس کو بے کار سمجھا۔ اسی کے مناسب ایک واقعہ یاد آیا ہمارے یہاں قریب کے ایک قصبہ میں ایک خون ہوگیا تھا۔ اُس میں دو آدمی ماخوذ ہوئے اور دونوں کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ حکم کے بعد پوچھا گیا تم کچھ چاہتے ہو تو ایک نے تو کہا کہ میرے بھائی کو بلادو اور مجھے غسل و نماز کی اجازت دو۔ چنانچہ اجازت ہوگئی اُس نے اپنے بھائی کو چند وصیتیں کیں اور کہا کہ یہاں آج میرا وقت پورا ہوچکا تھا

اگر پھانسی نہ ہوتی تو میں اور کسی طرح مرتا۔ پھر اُس نے دو رکعت نماز پڑھی اور کلمہ پڑھکے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور دوسرے نے اپنے عزیزوں سے اس قسم کی خرافات وصیتیں کیں کہ مثلاً میرا پیسہ کبھی کسی مسجد میں لگنے نہ پائے۔ اُس سے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ۔ تو کہتا ہے عمر بھر پڑھا تو کیا ہوا۔ اور اب پڑھوں گا تو کیا ہوگا۔ اسی کے بعد پھانسی ہوگئی نعوذ باللہ۔ تو بہر حال بڑی ضرورت ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی۔ جنمیں یہ آتا رہوں اور سب ہی معاصی ایسے ہیں خصوص یہ عشق نفسانی۔ اور اس میں ایک اور بڑی آفت ہے وہ یہ کہ اگر کسی نے جوانی میں احتیاط اور توبہ نہ کی ہو تو یہ مرض بڑھاپے میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس پر ایک تفریع فقہی کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ بوڑھے آدمی سے اپنے سیانے لڑکے اور سیانی لڑکی کو زیادہ بچانا چاہیئے۔ وجہ یہ کہ جوانی میں اگر شہوت زیادہ ہوتی ہے تو قوت ضبط بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس قوت ضبط ہی سے قوت شہوت میں لذت ہوتی ہے۔ تو اگر کوئی خوف حق سے ہی ضبط نہ کرے گا تو لذت ہی کے لئے ضبط کرے گا۔ اور یہ لذت معین ہو جاوے گی۔ ادامت ضبط پر اور اس سے رفتہ رفتہ وہ اس ضبط میں خوف حق کی نیت کر کے متقی بن جائے گا۔ اور بوڑھے میں گو قوت شہوت کم ہے مگر قوت ضبط بھی کم ہے۔ کیونکہ شہوت اور ضبط کا دارو مدار حرارت غریزیہ پر ہے اور وہ بڑھاپے میں کم ہو جاتی ہے اس لئے اُس میں ضبط کم ہوگا۔ پس وہ زیادہ احتیاط کے قابل ہے گو وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن افسوس یہ غضب ہے کہ لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو پیروں سے تو بالکل پردہ نہیں کرتے پیر خواہ جوان ہوں یا بوڑھے عورتیں اُن کے ہاتھ پیر دباتی ہیں۔ اے اللہ کہاں گئی شریعت اور کہاں گئی شرم و غیرت۔ ہم نے مانا کہ پیر صاحب ایسے پیر اور ایسے متقی ہیں کہ اُن سے خطرہ نہیں ہے مگر دوسروں کو اپنی بے حیائی کے لئے سند تو نہ ہو جاوے گی۔ بہر حال یہ مرض نظر بد عشق نفسانی سخت مرض ہے مگر علاج اس کا بھی ہے البتہ ذرا دارو ئے تلخ ہے مگر اُس تلخی کے ساتھ اُس میں دین کی لذت بھی ہے سو اُس کی لذت کے لئے تلخی کو تو گوارا کرلو شاید کوئی کہے کہ تلخی میں لذت کہاں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا تم مرچ نہیں کھاتے

کہ منہ سے بھی نہ جاری ہے اور ناک سے بھی اور آنکھ سے بھی مگر چھوڑتے نہیں تو دیکھئے تلخ ہے اور مزہ دار کسیکو مرچ کی عادت ہو تو تمباکو دیجئے اُس میں جتنی زیادہ تلخی ہو اُتنا ہی زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔ میں نے کبھی پیا نہیں مگر کھانے والے پینے والوں کے قصے سنے ہیں اس لئے تقلیداً کہتا ہوں۔ ہائے افسوس لذت کے سبب مرچوں کی تلخی تو مطلوب اور تمباکو کی تلخی مطلوب۔ مگر دین کی لذت کے لئے علاج کی تکلیف سے نفرت۔ کیا دین کی تمباکو اور مرچوں کی برابر بھی وقعت نہیں۔ اب وہ علاج بتلاتا ہوں۔ جس سے اس مرض عشق نفسانی سے شفا ہو جائے وہ علاج عرف یہ ہے کہ اُس کی طرف بالکل توجہ نہ کرے اور توجہ کی بھی قسمیں ہیں۔ توجہ بالقلب۔ توجہ باللسان۔ توجہ بالبصر توجہ بالید توجہ بالرجل تو ان سبکو ترک کرے یعنی نہ تو اُسکا تصور کرے نہ تذکرہ کرے۔ نہ اسکی طرف دیکھے نہ اُسے ہاتھ سے چھوئے نہ پیروں سے چل کے اُس تک جائے۔ خلاصہ یہ کہ جتنا اُس سے بُعد ہوگا اتنا ہی نفع ہوگا۔ اس میں مجکو ایک احتمال پیدا ہوا ہے کہ شاید کوئی یہ علاج شروع کرکے اگلے ہی دن کہنے بیٹھ جائے کہ علاج تو کیا مگر ابتک وہی حال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا تو امراض حسیہ میں بھی بہت ہوتا ہے کہ ایک مسہل میں درد نہیں جاتا بلکہ بعض دفعہ ایسے ایسے مسہل ہوتے ہیں تب کہیں مادہ خارج ہوتا ہے کوئی علاج نہیں چھوڑ دیتا۔ تو اس میں بھی جلدی نہ کرو علاج کرتے رہو انشاء اللہ تعالےٰ ضرور نفع ہوگا ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ اور سب باتیں تو آسان ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں زبان آنکھ سب قابو میں ہیں مگر دل کو کیا کریں کہ خیال آتا ہی ہے میں کہتا ہوں۔ النفس لا تتوجہ الی شیئین فی آن واحد یہ قضیہ لازمہ عادیہ ہے۔ اب تم یہ کرو۔ کہ کسی دوسری شئے کا تصور کیا کرو اُس کی طرف قصداً توجہ نہ کرو۔ قصداً دوسری طرف توجہ رکھو۔ اس سے وہ آپ دفع ہو جاوے گا۔ بلکہ یہ بھی نہ کرو کہ اُس کو قصداً دفع کرو کیونکہ اس سے تو پھر ادھر توجہ ہو گئی۔ غرض رفع کے قصد سے بھی اُدھر متوجہ نہ ہو اس کی مثال تار بجلی جیسی ہے کہ اگر ہٹانے کے لئے ہاتھ لگا دیا جب بھی لپٹے گا۔ اور کھینچنے کے لئے لگا یا تب بھی لپٹے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہاتھ ہی مت لگاؤ۔ نہ ہٹانے

کے قصد سے نہ لانے کے قصد سے اور یہی علاج ہے بعینہ وساوس کا کہ اُدہر توجہ نہ کی جاوے اس سے خود دفع ہو جاویں گے۔ اس میں بھی بعضے ایسی ہی غلطی کرتے ہیں کہ قصداً انھیں ہٹاتے ہیں حالانکہ اُس کا یہ علاج نہیں یہ لوگ علاج ہی میں غلطی کرتے ہیں بقول مولٰنا۔ ؎

گفت ہر دارو کہ ایشان کردہ اند　　آن عمارت نیست ویران کردہ اند

بے خبر بودند از حال درون　　استعیذ اللہ مما یفترون

مولانا نے یہاں ایک حکیم کی حکایت لکھی ہے کہ اُس نے ایک مریض کو دیکھکر کہا تھا کہ جتنا لوگوں نے علاج کیا ہے سب اُلٹا ہی کیا اسیطرح غیر محقق کے علاج کو محقق کہتا ہے۔ تصوف واقعی حکمت ہے اس میں بڑے ماہر محقق کی ضرورت ہے پس وسوسہ کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کو قصداً دفع نہ کرو۔ بلکہ دوسری طرف توجہ کرلو ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے یہ بھی کر کے دیکھا ہے کہ جب وساوس آتے ہیں تو الفاظ قرآنیہ کیطرف توجہ منصرف کر دیتے ہیں مگر اُس وقت بھی سامنے وساوس ہوتے ہیں اس کے جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اول ایک مثال سمجھئے اور وہ بھی مسئلہ فلسفہ ہی کا ہے وہ یہ کہ علم مناظر کا مسئلہ ہے کہ کسی چیز کے نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے شعاعیں نکلکر مرئی کو محیط ہو جاتی ہیں مگر جو چیزیں مرئی کے گرد وپیش ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ نظر آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک نقطہ ہے آپ ٹکٹکی باندھ کے اسیکو دیکھ رہے ہیں مگر آس پاس کے دوسرے نقطے بھی بلا قصد نظر آتے ہیں اگر کوئی اُستاد حکم دے کہ اور نقطہ کو مت دیکھو تو مطلب یہ ہے کہ بالقصد مت دیکھو کیونکہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اسیطرح نفس کی حالت ہے کہ جب قصداً تم مثلاً الفاظ قرآنیہ کو ذہن سے دیکھ رہے ہو تو علاج پر عمل ہو گیا۔ گو اور چیزیں جو متخیلہ میں جمع ہیں وہ بھی ذہن کے سامنے آجاویں پس اُن کا خیال آنا منع نہیں ہے ہاں لانا منع ہے۔ اب اس پر کوئی کہے کہ جب وساوس آ گئے خواہ لانے سے یا بے لائے تو پھر علاج کا فائدہ کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں۔ کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چندروز تک تو وہ آتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر خود ۔ بخود

غائب ہو جاتے ہیں اور یہی فرق ہے بصیرت و بصارت میں کہ بصر سے تو وہ گرد و پیش کی چیزیں غائب نہیں ہوتیں مگر بصیرت سے غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر اُس وقت یہہ حالت نصیب ہو جاتی ہے۔ ؎

دل آرامے کہ داری دل در و بند ۔۔۔ دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اسیطرح تم وساوس کے ہجوم کے وقت کسی دوسری چیز کی طرف توجہ منعطف کر لیا کرو۔ چاہے وہ دوسری چیز کلام ہو چاہے ڈھیلا مٹی اور چاہے تصور شیخ ہو۔ اس اثر میں سب برابر ہیں اور یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق بھی ہو گئی کہ وہ کوئی مستقل شغل نہیں ہے۔ بلکہ اُس کا تصور اس لئے دل میں لاتے ہیں۔ تاکہ خطرات دفع ہو جاویں اور گویہ غرض دوسرے تصورات سے بھی حاصل ہو سکتی ہے مگر شیخ محبوب ہے اور محبوب کے تصور کو اس غرض میں زیادہ دخل ہے۔ اس لئے اہل طریق نے اس کو اختیار کیا پھر جب خطرات دفع ہو گئے جس کی ضرورت سے تصور شیخ کیا تھا اب شیخ کو بھی رخصت کر دو اور خالص ذات الٰہی کیطرف توجہ کرو۔ جیسے دولھا اور دلھن کو بیچ میں مشاطہ اور نائن ہوتی ہے۔ مگر جب خلوت کا وقت آتا ہے تو صرف دولھا اور دولھن رہ جاتے ہیں اور نائن باہر کر دی جاتی ہے تو تصور شیخ مشاطہ تھا توجہ بحق کے وقت یہ بھی رخصت بقول مولانا ؎

جلوہ بیند شاہ و غیر شاہ نیز ۔۔۔ وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز

اور یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہو گا کہ پیر کا حق اُس کو رہبر بنانا ہے پرستش نہیں ہے کیونکہ معبود کبھی علٰحدہ نہیں کیا جاتا۔ اسیطرح عشق نفسانی میں جب محبوب کا خیال بلا قصد آئے تو اُس وقت دوسرے کسی مباح التصور امر کا تصور کرلے تو اس سے محبوب مجازی کی صورت آہستہ آہستہ اکھڑ کر جاتی رہتی ہے اور یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ جاتے رہنے کی بھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اول بتدریج میلان میں کمی ہو گی پھر چند روز کے بعد میلان بالکل نہیں رہے گا۔ مگر اس کے بعد کچھ کچھ محبت معلوم ہوا کرے گی۔ مگر ادنےٰ اہتمام سے وہ مضمحل ہو جاوے گی۔ اس میں

بھی بعضوں کو غلطی ہوتی ہے کہ جب دوبارہ پھر میلان ہوا۔ تو وہ سمجھا کہ میرا مرض پھر عود کر آیا۔ مگر نہیں وہ مطمئن رہے کہ مرض نے عود نہیں کیا۔ ورنہ ادنےٰ اہتمام سے دفع نہ ہوتا ازالۂ رذائل کے معنی یہی ہیں کہ غلبہ جاتا رہے۔ باقی جڑ باقی رہتی ہے۔ اور اس قدر اصل کا باقی رہنا بھی حکمت الٰہیہ ہے۔ کیونکہ اگر رذائل کی اصل ہی نہ رہے۔ تو پھر مقاومت کا اجر کیسے ملے۔ اسیکو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

شہوت دنیا مثال گلخن است کہ از و حمام تقویٰ روشن است

گوبر کے اُپلے اور کنڈے نجس تو ہیں مگر یہ نہ ہوں تو حمام کا پانی گرم نہیں ہو سکتا اسیطرح تقوے کا نور بھی شہوت ہی سے ہے بشرطیکہ اُس کو جلاتے رہو جمع کر کے دل میں نہ رکھو۔ الحمد للہ ہر پہلو سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا۔ اور عشق نفسانی کا علاج معلوم ہو گیا۔ یعنی اس طرف التفات نہ کرو اس سے محبت مغلوب ہو جاوے گی اور مطلق میلان نہ ہونا مطلوب نہیں اگر اتنا میلان بھی نہ ہو تو بے حسی ہے جیسے گلاب میں سے کسی کو خوشبو کے بجائے بدبو آنے لگے تو معلوم ہوا۔ اس کی قوت شامہ خراب ہو گئی ہے کیونکہ اچھی چیز تو اچھی ہی لگنی چاہیئے۔ اگر ایسا ہو تو یہ شخص سلیم الحواس نہیں۔ پس میلان سے تو نہ گھبراؤ۔ ہاں اُس کے مقتضاء پر عمل نہ کرو۔ یعنے میلان کے بعد اُس کو دیکھنے میں مشغول نہ ہو کہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھکر قصداً دوسری طرف مشغول ہونا بڑی غیرت کی بات ہے۔ اگر خود غیرت نہیں رہی تو غیرت حق کو سوچو اور دیکھو کہ اگر کسیکو بادشاہ کا قرب میسر ہو جاوے اور اُس کو محل میں جانے کی اجازت ہو جاوے اور وہ وہاں جاکے لونڈیوں کو دیکھنے لگے۔ تو بادشاہ کیا کہے گا۔ اسیطرح خدا کو بھی غیرت آتی ہے کہ اُس کے ہوتے ہوئے لوگ فواحش میں مبتلا ہوں۔ حقیقت میں خدا کے ہوتے ہوئے کسی اور پر نظر کرنا بڑی سخت بات ہے۔ اختتام مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک خوبصورت عورت جا رہی تھی ایک شخص اُس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ سمجھ گئی۔ اُس نے کہا کہ مجھے کیا دیکھتا ہے۔ میرے پیچھے میری دوسری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ حسین ہے۔ یہ

اُس کے دیکھنے کے لئے پلٹا۔ اُس نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی ۔ در بیان دعوی خود صادقی

پس چرا بر غیر افگندی نظر ۔ ایں بود دعوی عشق اے بے ہنر

جب اُس عورت کو غیر پر نظر کرنے سے اتنا غیظ ہوا۔ تو کیا حق تعالےٰ کو غیظ نہ ہوگا۔ غرض یہ مرض بڑا شدید ہے ابتداء میں تو صغیر ہے۔ مگر انتہا میں اور انتہا میں شدید و مدید ہے۔ اصل میں یہ گفتگو اس پر تھی کہ ایک شخص بے نمازی کو تو بُرا سمجھتا ہے مگر اپنی بد نگاہی سے نفرت نہیں کرتا۔ جس کے اتنے مفاسد ہیں۔ تو بعضے ایسے لوگ جنکے عقائد درست ہیں اُن کو ترک عمل سے اتنی نفرت نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہئے۔ بس اس پر بے فکری ہے کہ عقائد تو درست ہیں۔ اور یہ غلطی بکثرت اہلِ علم کو یا اُن کی صحبت والوں کو ہوتی ہے۔ یعنے اگر وہ کسی کی نسبت مثلاً یہ سُن لیں کہ یہ شخص بدعات سے مجتنب ہے گو اُس کے تمام اعمال تباہ ہوں۔ بس پھر اُسے اُس اہل بدعت پر بھی ترجیح دینے لگتے ہیں۔ جہاں منشاء بدعت کا محض خطائے اجتہادی ہی ہو۔ یہ غلو فی الدین نہیں تو کیا ہے۔ اُنھوں نے عبادت کے درجات کو چھوڑ کر عقائد کو اساس قرار دیکر فروع کو بے وقعت سمجھ لیا ہے۔ جیسے کوئی درختوں کی شاخیں کاٹ دیا کرے اور صرف تنہ دیکھکر خوش ہوا کرے کہ باغ لگا ہوا ہے حالانکہ اس باغ دین کی تو یہ شان ہے۔ ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود ۔ گر ز باغ دل خلالے کم بود

کہاں تو یہ حالت کہ ایک تنکا بھی کم ہونا گوارا نہیں۔ اور کہاں یہ کہ تمام شاخیں کاٹ کے بھی خوش ہیں۔ کہ جڑیں تو ہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بنیاد بھر کر خوش ہو کہ میں نے مکان بنا لیا ہے اگر کسی نے بنیاد بھر دیں اور مکان بنایا نہیں تو برسات آنے دو۔ اب پانی برسا تو کپڑے بہے بہے پھرتے ہیں سب سامان بھیگ رہا ہے اب سمجھ میں آیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو بنیاد کو کافی سمجھا۔ کام تو دیواروں اور چھت سے پڑے گا گو بقاء اُن کا بیشک بنیاد سے

ہے۔ میں نے بڑی نادانی کی کہ پہلے ہی بنیاد کے ساتھ دیواریں نہ بنالیں۔ ہاں البتہ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ جس کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں اس کی عمارت جب بنے گی جلدی تیار ہوگی۔ اور مضبوط بنے گی اور جسکی جڑ ہی کھوکھلی ہوگی اُس کو مشکل ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اہم الاجزاء عقائد بیشک ہیں۔ مگر اُن کے بعد دوسرا درجہ اعمال کا بھی تو آخر کچھ ہے۔ ایک غلطی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض لوگ تصحیح عقائد کو ضروری نہیں سمجھتے۔ تسبیح نماز روزہ تو کرتے ہیں مگر عقائد کی تصحیح کی فکر نہیں کرتے اور اکثر اس میں اُن کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ قصور اُن کا ہے جو بیعت کرکے کچھ وظائف بتلا کے خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی فکر ہی نہیں کہ عقائد اس شخص کے کیسے ہیں۔ جنکی یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ ایک درویش صاحب نے مجھ سے پوچھا تصور شیخ جائز ہے یا ناجائز۔ میں نے کہا پہلے آپ اس کے معنے بتلایئے تو کہتے کیا ہیں کہ خدا کو پیر کی شکل میں سمجھنا نعوذ باللہ۔ وہ حضرت پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے اور تہجد و ذکر والے بھی تھے اور عقیدہ یہ۔ اور پھر مزہ یہ کہ اس بدعقیدگی کو مضر نہیں سمجھتے۔ ایک شخص نے مجھے خط لکھا۔ کہ جب نماز تنہا پڑھتا ہوں تو وساوس نہیں آتے۔ اور جب جماعت سے پڑھتا ہوں تو وساوس بہت آتے ہیں تو جی چاہتا ہے جماعت چھوڑ دوں۔ تو یہ بزرگ خلاف سنت کو سنت سے افضل سمجھ رہے تھے۔ درحقیقت یہ طریق بہت نازک ہے۔ عارف شیرازی نے خوب کہا ہے۔ ؎

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے است ہشدار گوش را بہ پیام سروش دار

یعنے ہر قدم پر وسوسہ ہے شیطان کا بس وحی کا اتباع کرو دیکھئے کتنے بڑے دھوکہ میں مبتلا کیا شیطان نے کہ حضور قلب نماز کی روح ہے اور ہر شئے میں مقصود روح ہوتی ہے تو نماز میں بھی زیادہ مقصود حضور قلب ہی ہے۔ اس کے بعد دیکھا کہ جماعت میں یہ روح ملتی نہیں اور قاعدہ ہے کہ الشئی اذا خلا عن فائدتہ انتفی۔ یعنے جو شئے مقصود سے خالی ہوگی وہ منتفی ہوجائے گی۔ بس یہ نتیجہ نکال کے

گمراہ ہوا کہ جماعت ہی نماز نہ پڑھے۔ اس کا ایک جواب قاطع بحث تو یہ ہے۔ کہ ترک جماعت جب شریعت کے خلاف ہے تو اس میں ہزار مصالح ہوں سب لغو ہیں یہ تو سنار کی سو کھٹ کھٹ کے مقابلہ میں لوہار کی ایک ہے۔ خیر میں کھٹ کھٹ کا ہی جواب دیتا ہوں کہ حقیقت میں یہ بنا الفاسد علی الفاسد ہے۔ اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ حضور قلب کے یہی معنے ہیں جو سائل نے سمجھے۔ یعنی وساوس کا نہ آنا لفظ حضور قلب تو ایک تعبیر ہے اور حقیقت اُس کی احضار القلب ہے اہل علم تو اتنے ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر میں سب کے سمجھنے کے لئے تفصیل بھی کئے دیتا ہوں یعنے ایک تو ہے وساوس کی آمد اور ایک ہے آورد۔ سو آورد مضر ہے۔ آمد مضر نہیں تو مقصود نماز میں صرف قلب کو اپنے قصد سے حاضر کرنا ہے۔ پھر خواہ حاضر ہو یا نہ ہو اور یہ احضار خواہ ذکر کی طرف توجہ کرنے سے ہو خواہ مذکور کی طرف توجہ کرنے سے ہو۔ یعنے اسکے دو طریقے ہیں۔ مبتدی کے لئے تو یہ ہے کہ ذکر کی طرف توجہ کرے اس کا طریقہ نہایت سہل ہمارے اُستاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتایا تھا کہ نماز کے ہر جزو کو اپنے قصد سے ادا کرو۔ صرف یاد سے مت پڑھو۔ یعنے انتو یہ عادت ہے کہ گھڑی کی کوک کی طرح اللہ اکبر کہہ لیا کہ یہ تو نماز کی کوک ہے اور الحمد اور انا اعطینا اور قل ہو اللہ یہ سب ہی کو از بر ہے۔ بس شروع سے آخر تک سب خود بخود نکلتا چلا گیا۔ تو ایسا مت کرو بلکہ اللہ اکبر کہو تو سوچ کے اور ارادہ سے کہو کہ میں اللہ اکبر کہہ رہا ہوں اس کے بعد سبحانک اللھم پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ ایک ایک لفظ کو مستقل ارادہ سے کہو پھر اسیطرح الحمد پڑھو۔ پھر اسیطرح سورت ملاؤ۔ غرض ہر ہر لفظ ارادہ سے ادا کرو۔ یہ تو مبتدی کا طریقہ تھا۔ اور منتہی کا یہ ہے کہ بلا واسطہ حضرت حق کی طرف توجہ کو قائم کردے اور یہ حالت جب ہی حاصل ہوگی۔ جبکہ اول مبتدی طرح عمل کروگے۔ بس تم اول ذکر پر توجہ کرو پھر شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔ اور اس سے ایک نکتہ اور سمجھ میں آیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا تو یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ واذکر ربک کیوں نہیں فرمایا

اسم کیوں بڑھایا۔ اس کے جواب میں بعض نے کہا ہے کہ اسم زائد ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اسم کو زائد کہنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس میں مبتدی کا درجہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہی کی طرف توجہ کرے تو کافی ہے پھر اسی سے مسمیٰ تک پہنچ جاوے اور وتبتل الیہ میں منتہی کا کیونکہ ابھی بلا واسطہ ذکر رب پر قدرت نہیں۔ اس لئے اُس کو ذکر اسم رب کافی ہے اور منتہی کو اس پر قدرت ہے۔ اس لئے اُس کو حضرت حق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ مگر یہ تفسیر نہیں نکتہ ہے۔ لیکن اس پر میرا استدلال موقوف بھی نہیں۔ بہر حال احضار قلب کے دو طریقے ہیں۔ ایک بواسطہ توجہ الی الذکر کے اور ایک بلاواسطہ توجہ الی المذکور کے تو روح نماز کی یہ احضار قلب ہے اگر اس احضار کے بعد وسوسے آویں تو یہ حضور قلب کے منافی نہیں ہے تو جماعت کی نماز میں جب احضار کر لیا گو حضور نہ ہو تو یہ کہنا سراسر غلط ہو گیا کہ جماعت میں حضور قلب نہیں ہوتا۔ تو دیکھئے کتنی بڑی دولت سے شیطان نے محروم کرنا چاہا تھا۔ حدیث شریف میں ہے۔ جماعت کی ایک نماز میں پچیس نماز کا ثواب ملتا ہے۔ اس لئے کسی بات میں اپنی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ شریعت پر چلتے رہو۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست — بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

صراط مستقیم سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حالت شریعت کے موافق ہو تو پھر جو حالت بھی بلا اختیار پیش آوے جیسے لفظ آید اس پر دال ہے وہ سب خیر ہی ہے۔ خواہ وساوس ہوں یا اس سے بڑھکر کچھ ہو۔ اسیطرح دعا میں بھی شیطان بہکاتا ہے کہ ہماری دعا ہی کیا جب حضور قلب نہ ہو۔ ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں بہت مقروض ہو گیا ہوں۔ میرے لئے ادار قرض کی دعا کرو۔ میں نے کہا میں بھی کرتا ہوں تم بھی کرو۔ کہنے لگے ابھی ہماری دعا ہی کیا۔ میں نے کہا کہ کلمہ طیبہ جس سے آدمی مسلمان ہوتا ہے افضل ہے یا دعا۔ کہنے لگے کلمہ طیبہ۔ میں نے کہا بس یہی کہکے اسے بھی چھوڑ دو کہ ہمارا اسلام ہی کیا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ ہے اسیکو غنیمت

سمجھو۔ بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے۔ غرض ایسے ہی جہل سے لوگوں کے عقائد خراب ہو رہے ہیں اور جب عقائد خراب ہوئے تو عبادت بھی ناقص ہوگی۔ کیونکہ عبادت کے معنے عبد شدن ہیں۔ اور اس میں عقائد و اعمال سب داخل ہیں جب ایک جزو بھی ناقص ہوا تو مجموعہ ضرور ناقص ہوگا۔ یہ پہلی اور دوسری غلطی تو عقائد و اعمال کے متعلق تھی۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ بعض نے معاملات کو ضروری نہیں سمجھا چنانچہ اجارات و تجارات میں بیع و شراء میں باستثناء شاذ و نادر کوئی جانتا تک بھی نہیں۔ کہ اس کے متعلق شریعت میں کچھ احکام بھی ہیں۔ ریل میں بے ٹکٹ سفر کرنے کو حرج نہیں سمجھتے۔ اور جو ٹکٹ لیتے ہیں تو فاصلوں سے زائد اسباب لیجانیکو برا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ ریل حق العبد ہے۔ جب ہم اُس کو استعمال کیا ہے تو ہمیں اُس کا معہودہ کرایہ بھی دینا چاہئے۔ اسیطرح مدارس کے اور انجمنوں کے چندے بھی حق العبد ہیں۔ اُس کی تحصیل میں جبر کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ بلکہ قصداً زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ زیادہ چندہ وصول ہو۔ اسیطرح کل معاملات میں سخت بے پروائی ہے۔ چنانچہ اس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ جس طرح نماز روزہ میں علماء سے پوچھتے ہیں معاملات میں کبھی نہیں پوچھتے۔ رہن نامہ بیعنامہ کی دستاویز لکھکر وکیل کو نہ دکھائیں گے کہ قانون حکومت کے خلاف تو نہیں۔ مگر کسی عالم کو کبھی نہیں دکھائیں گے۔ کہ قانون شرعی کے تو خلاف نہیں۔ اسیطرح مقدمہ میں جھوٹ بولنا کہ اس میں علماء سے مطلق نہیں پوچھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہے لعنۃ اللہ علی الکذبین اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھے پر ہی فتویٰ ملے گا تو پوچھکر خود کیوں لعنت لیں۔ اپنے فعل پر لعنت سننے پر غور کے ایک معلم کا قصہ یاد آیا۔ کہ ایک لڑکا اُستاد سے قرآن کا سبق لے رہا تھا اور اُستاد کی طرف منہ کرکے اس آیت کا تکرار کر رہا تھا۔ وان علیک اللعنۃ الی یوم الدین ط۔ وان علیک اللعنۃ الی یوم الدین استاد اس ہیئت خطاب سے جھنجلا گیا اور کہا۔ ان علیک اللعنۃ وعلی والدیک لڑکا سمجھا کہ آیت یونہی ہوگی اُس نے یونہی کہنا شروع کر دیا۔ ان

علیک اللعنۃ و علی والدیک۔ غرض جھوٹ بولنے کی نسبت علماء سے نہیں پوچھیں گے میں کہتا ہوں کہ پوچھا تو ہوتا۔ شاید اجازت ہی مل جاتی اور گو بات تو کہنے کی نہ تھی مگر کیا کروں اس کے کہنے کی بھی ضرورت ہے۔ کہ بعض جگہ جھوٹ بولنا بھی جائز ہے تم پوچھتے تو دیکھو معلوم ہو گا کہ کہاں کہاں جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل میں اس وقت نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ میں اس وقت فقہ کی کتاب تھوڑا ہی لکھ رہا ہوں۔ مگر اس اجمال کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ علماء سے وحشت مت کرو اور یہ بدگمانی مت کرو کہ وہ ہر جھوٹ کو حرام ہی کہیں گے۔ اسی سے تو لوگ درویشوں کو اچھا سمجھتے ہیں کہ کسیکو روکتے ٹوکتے نہیں شفقت سے کسی کو کچھ کہدیا۔ اور کسیکو یا وا بنادیا۔ مگر بشارت دیتا ہوں کہ آجکل تو نوعمر مولوی بھی اسیطرح کا برتاؤ کرنے لگے ہیں۔ کہ باوجودیکہ وہ آپ کی سب بیہودہ حالت سمجھتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے مثلاً میں کسیکی ڈاڑھی مونڈی ہوئی دیکھتا ہوں۔ مگر کہتا دلشکنی سمجھتا ہوں۔ تو آپ اس زمانہ کے نوعمر تہذیب دیدہ مولویوں کے پاس جائیے اور نوعمر کے یہ معنے نہیں کہ وہ آپ سے بھی زیادہ نوعمر ہوں۔ اس وصف میں تو آپ ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ جیسے نوشیرواں سے کسی نے شکایت کی۔ کہ فلاں شخص نے مجھپر ظلم کیا تو نوشیرواں نے کہا کہ تو کوتہ قامت یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کوتہ قامت پر ظلم کر سکے وہ خود منفعل ہوتا ہے اس نے کہا اجی جس نے مجھپر ظلم کیا وہ مجھ سے زیادہ کوتہ قامت ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے ایسا ہی نکلا۔ بلکہ نوعمر کا مطلب یہ ہے کہ بہت پرانے مولویوں کے سامنے جو نوعمر ہوں گے۔ وہ تامل کرینگے تو اخلاقاً وہ بھی درویش ہی ہیں وہ آپ کی بہت خاطر کریں گے۔ تہذیب کے ساتھ پیش آویں گے۔ یہاں تک کہ آپ کے دل میں اُن کی محبت پیدا ہو گی تو آپ خود ڈاڑھی رکھ لیں گے کیونکہ اُن کے اخلاق دیکھکر پھر آپ منڈواتے ہوئے خود شرمائیں گے۔ مگر اسکو منکر ڈرمت جانا کہ بس جی اگر مولویوں سے ملنے میں یہ خاصیت ہے کہ خود بخود ڈاڑھی رکھ لیتا ہے تو ہم ملیں ہی کے نہیں۔ جیسے کسی نے

کہا تھا کہ چاند دیکھ کے روزہ فرض ہو جاتا ہے۔ دوسرے نے کہا میں دیکھوں ہی گا نہیں جو فرض ہو۔ مگر صاحب جب مولوی آپ سے ڈاڑھی کی بابت کچھ نہ کہیں بلکہ آپ بدون کہے خود ہی رکھلیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے۔ جبکہ آپ بلا کلفت ڈاڑھی رکھلیں۔ پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔ بہرحال آپ علماء سے ضرور ملئے اور ہر بات کو ضرور پوچھئے۔ بلکہ میں تو علی سبیل الترقی کہتا ہوں کہ اگر عمل نہ بھی کرنا ہو تب بھی پوچھئے کیونکہ اگر مسئلہ بھی نہ معلوم ہوا تو ایک تو ترک علم کا گناہ ہوا اور ایک ترک عمل کا۔ تو اس میں ایک یہی فائدہ ہو گا کہ تحصیل علم کا فرض تو ادا ہو جائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کبھی توفیق عمل کی ہو گئی تو علم تو اپنے پاس ہو گا جیسی کسیکو فلانش ہوا اور وہ نسخہ کا ایک جزو گندھک سن لے اور بدبودار سمجھ کے نسخہ ہی نہ سنے یہ اُس کی غلطی ہے کم از کم نسخہ تو معلوم کر لے کہ اگر کبھی علاج کو جی چاہے تو اس وقت طبیب کو تو ڈھونڈھنا نہ پڑے گا۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ علم کی خاصیت خشیت ہے۔ امام غزالی نے ایک بزرگ کا مقولہ لکھا ہے کہ ہم نے علم اور اغراض سے سیکھا تھا کہ تحصیل علم کے بعد قاضی بنیں گے مفتی بنیں گے مگر علم نے ہمیں چھوڑا نہیں اور وہ ہمیں اللہی کا بنا کے رہا تو علم کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی خشیت پیدا ہی ہو جاتی ہے۔ تو علماء سے احکام ضرور پوچھ لیا کرو۔ اور ہر امر کے متعلق پوچھا کرو۔ مثلاً مقدمہ عدالت میں لے جاتا ہو تو بھی علماء سے پوچھ لیں۔ جب آپ ہر بات کو پوچھیں گے۔ اُس وقت آپ کا یہ گمان کہ علماء سے صرف لا یجوز کا سبق پڑھا ہے۔ غلط ثابت ہو گا۔ بہرحال معاملات سے آجکل اتنی بے فکری ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو دین میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔ اور اگر کوئی پوچھنے کو کہے بھی تو کہتے ہیں۔ مولویوں کو اس سے کیا بحث اُن کا کام نماز روزہ کا بتلانا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ خیال بالکل ہی غلط ہے قرآن و حدیث و فقہ میں سب چیزوں کی تعلیم موجود ہے۔ معاملات کی بھی معاشرت کی بھی۔ لیکن معاشرت کو معاملات سے بھی زیادہ دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ کہ لباس پہنیں گے دوسری اقوام کا سا۔ باتیں کریں گے تو انھیں کی زبان دبا انھیں

کے لب و لہجہ میں۔ حتےٰ کہ کمرہ بھی سجائیں گے تو اسیطرح جنکے معنے یہ ہوئے کہ ہم معاشرت میں بھی دریوزہ گر ہیں دوسری قوموں کے۔ اور گویا اس کا اقرار ہے اور نہایت گندہ اقرار ہے کہ ہمیں اس کی تعلیم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دی۔ حالانکہ ان قوموں نے خود حضورہی کی تعلیم سے معاشرت کا طریقہ سیکھا ہے۔ مگر آپ کی تو وہ حالت ہے۔ ؎

یک سبد پرنان ترا بر فرق سر — تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئی میاں قعر آب — از عطش وز جوع گشتستی خراب

یعنے سر پر ٹوکرا روٹیوں کا اور پیروں کے نیچے اتنا پانی کہ تو سارے شہر کو سیراب کر دے۔ مگر عادت تو پڑ گئی ہے بھیک ملنگنے کی۔ اس لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ جیسے ایک چلتی پھرتی عورت کی حکایت ہے۔ کہ بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ مگر تھی حسین۔ بادشاہ کو پسند آگئی۔ اپنے ساتھ لے گیا مگر تھوڑے دنوں میں دبلی ہو گئی۔ بادشاہ کو تعجب ہوا۔ کہ اس عیش و عشرت میں دبلا ہونے کے کیا معنے اُس سے بھی پوچھا۔ کہنے لگی میں آپ کی ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی ہوں مجھے کھانا الگ دیدیا کیجئے۔ خیر بادشاہ نے ایسا ہی کیا تو تازہ ہونا شروع ہوئی۔ بادشاہ نے ماماؤں سے کہا کہ یہ کیا کھاتی ہے اُنھوں نے کہا ہماری سامنے تو کھاتی نہیں کھانا رکھوا کر ہمکو رخصت کر دیتی ہے۔ اور کمرہ بند کر لیتی ہے بادشاہ نے کہا کہ روشندان میں سے دیکھو۔ کہ کیا کرتی ہے۔ جب ماما کھانا رکھکر چلی گئی۔ تو اُس نے حسب معمول دروازہ بند کر لیا۔ اب روشندان میں سے جھانک کے دیکھا تو اُس نے یہ کیا کہ روٹی تو ایک طاق میں رکھی اور پیالہ دوسرے طاق میں۔ اور رکابی تیسرے طاق میں۔ اور ایک طاق کے پاس گئی۔ اور کہا کہ اللہ کے واسطے ایک ٹکڑا دیدے۔ بس ایک لقمہ کھا لیا۔ پھر دوسرے طاق کے پاس گئی اور اسیطرح کہا پھر ایک لقمہ کھا لیا۔ بس اسی طرح سارا کھانا کھا لیا۔ بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا۔ تو فوراً اُسے نکالا کہ کمبخت اب بھی بھیک کی عادت نہ گئی۔ واللہ

اب مجھے بہت افسوس ہے کہ یہی حالت ہماری ہے کہ اپنے یہاں کی دولتیں ناپسند اور دوسروں کے یہاں کی بھیک مانگی ہوئی پسند۔ کوئی کام ہندو کرنے لگیں یہ بھی اُن کی دیکھا دیکھی کھڑے ہو جائیں گے۔ عیسائیوں کو کچھ کرتے دیکھیں گے اُن کی حرص میں یہ بھی کرنے لگیں گے۔ اور پھر تقلید بھی کریں گے۔ تو کورانہ۔ بے سمجھے۔ پھر اُس میں بھی استقلال نہیں کہ چار دن میں بیٹھ رہیں گے۔ حالانکہ دوسری قومیں جو کام کرتی ہیں نباہ کر کرتی ہیں۔ غرض معاشرت بھی جزو دین ہے اس کو بھی اپنے ہی گھر سے سیکھو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ایسی اعلٰے درجہ کی تعلیم دی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب کوئی رواج ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا میں بطور مثال کے ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا ہے کہ اگر تین آدمی ہوں دو آدمیوں کو تیسرے سے جدا ہوکے سرگوشی کی اجازت نہیں۔ سلف کا دستور یہ تھا کہ ایسے موقع پر جب چوتھا آدمی آجاتا تب اُن میں سے دو اُٹھ کے سرگوشی کر لیتے۔ تاکہ تیسرے کی دل شکنی نہ ہو۔ میں کہتا ہوں کسی مذہب میں بھی ایسا قانون ہے۔ بھلا کوئی اس کی نظیر دکھلا تو دے۔ آج کسی تمدن میں بھی ایسے قانون کا پتہ نہیں واقعی جو اصول اسلام نے سکھائے ہیں وہ کسی قوم میں بھی نہیں ہیں تو دوسری اقوام کے سامنے اپنے بزرگان دین کو پیش کرکے یہ کہوں گا۔ ؎

اولئک اٰبائی فجئنی بمثلھم — اذا جمعتنا یا جریر المجامع

بھلا کوئی لا سکتا ہے ایسے اصول۔ بس یہیں تو وہی معاشرت چاہیئے جس کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی۔ اور گو وہ ظاہر میں شاندار نہ ہو تو نہو مگر واللہ ہیبت اصلی اس میں ہے۔ بقول مولٰنا۔ ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست — ہیبتِ ایں مرد صاحب دلق نیست

یہ شعر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قصے میں ہے کہ اُن کو سفیر روم نے اینٹ پر سر رکھکر سوتے دیکھا تھا اور اسی حالت میں جب چہرۂ مبارک پر نظر پڑی تو مارے

رعب کے کانپ اٹھا۔ اس پر سخت متعجب ہوا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ بیشک یہ شخص حق پر ہے اور یہ حق ہی کی ہیبت ہے۔ ؎

ہیبت حق است ایں از خلق نیست ہیبتے از صاحب ایں دلق نیست

اب بھی دیکھ لیجئے کہ جس شخص کو اللہ سے جتنا تعلق ہوتا ہے قلوب میں اتنی ہی ہیبت زیادہ ہوتی ہے کہ بادشاہ سے بھی نہیں ہوتی۔ اور اس ہیبت کے ساتھ ہی اُس کی محبت بھی بے حد ہوتی ہے۔ بہرحال یہ تو ہماری روزمرہ کی معاشرت کا حال ہے۔ پھر شادی بیاہ میں اور غمی کی رسموں میں تو شریعت سے استفتاء کون کرے یہ تو گویا ہماری قومی باتیں ہیں۔ شریعت کو ان سے کیا غرض۔ نعوذ باللہ۔ اسی لئے ان رسموں میں وہ روپیہ اڑتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ہمارے اطراف میں کیرانہ ایک قصبہ ہے وہاں کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بیمار ہوا۔ اُس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا اجی حکیم جی جس طرح ہو اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو۔ کیونکہ چانول بہت مہنگے ہیں برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ مجکو باپ کے مرنے کا تو غم نہیں ہے صرف برادری کے کھلانے کی فکر ہے۔ کس قدر معاشرت بگڑی ہے اسی طرح خود ہمارے قصبہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساس مرگئی تو بہو بیٹھی رو رہی تھی کہ کفن دفن تو کسیطرح چندہ خیرات سے ہو ہی جائے گا۔ مگر آٹھ آنہ کے پان برادری کے لئے کہاں سے لاؤں جب میں نے سُنا تو اپنے گھر میں کہا کہ گو ایسے موقع پر رسماً جانا جائز نہیں اور تم کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو۔ مگر خدا کے لئے جس کے گھر میت ہو وہاں ضرور جایا کرو۔ اور جاکے پاندان پر قبضہ کرلیا کرو۔ اور کسیکو پان نہ کھانے دو۔ یہ کہاں کی مصیبت ہے۔ چنانچہ انھوں نے جب سے ایسا کیا۔ الحمد للہ ہمارے یہاں سے تو یہ رواج اُٹھ گیا۔ کیوں صاحب یہی معنے ہیں دین کے کہ اس طرح پر ایامال کھا جایا کرو اس وقت بہت وقت ہوگیا ہے اس لئے میں پانچواں جزو یعنے اخلاق کے یہاں پر ختم کردوں گا۔ اول یہ سمجھئے کہ اخلاق کیا چیز ہیں۔ اس کی حقیقت سے اپنے نفس کی اصلاح کرنا سو اس کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں رہا بس مرید ہوگئے

اور عقیدہ پکا لیا کہ پیر اللہ میاں کے یہاں بخشوائیں گے۔ ادھر پیر روپیوں سے مطمئن ہو گئے کہ اب سلسلہ میں تو آ ہی گیا پھر کیا غم گویا ایک خاندانی رسم و رواج بنگیا ہے۔ چنانچہ بعض اطراف میں یہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ اگر ایک خاندان میں کا ایک شخص کسی کا مرید ہو گیا تو اب سارے خاندان کو اسی کا مرید ہونا ضروری ہے پھر اُنکی اولاد کو اُس پیر کی اولاد کا مرید ہونا ضروری ہے گو اہلیت کا نام و نشان بھی نہ ہو تو بجز گمراہ کرنے کے اس مشیخت کا کیا نتیجہ ہے۔ ایک ایسے ہی گمراہ کن پیر جی کا قصہ یاد آ گیا کہ مریدوں کے گھر گوجروں کے کسی گانوں میں پہونچے کچھ دُبلے ہو رہے تھے۔ ایک گوجر مرید نے پوچھا پیر جی دبلے کیوں ہو رہے ہو۔ اُنھوں نے کہا کہ کمبختو تم لوگ نہ نماز پڑھتے ہو نہ روزہ رکھتے ہو تمہارے بدلہ مجھی کو روزہ نماز کرنا پڑتا ہے اور پھر سب سے بڑھکر یہ بھی فکر کہ تم سب کے بدلے مجھی کو پل صراط پر چلنا پڑتا ہے پھر بتلاؤ دبلا ہوں یا نہ ہوں۔ مرید بڑا خوش ہوا کہ واقعی پیر جی ہماری طرف سے بڑی محنت کرتے ہیں۔ خوش ہو کے کہنے لگا کہ جا فلانا کھیت دہان کا تم کو دیدیا پیر جی تھے ہوشیار کہا کہ چلکے قبضہ کرا دے۔ اب یہ بڑے خوش کہ اچھا احمق پھنسا دھانوں کے کھیت میں پانی تو بہت ہوتا ہے اور رینڈ ذرا پتلی ہوتی ہے جس کی عادت نہو وہ اُس پر سے نہیں گذر سکتا۔ پیر جی اُس پر سے چلے تو پیر لڑکھڑایا اور کھیت میں جا رہے۔ مرید نے جو پیر جی کو گرتے دیکھا تو اوپر سے ایک لات دی کہ تو بڑا جھوٹا ہے جب اتنے چوڑے راستہ پر نہیں چل سکا تو پل صراط پر کیا چلے گا جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے جا ہم کھیت نہیں دیتے۔ اب پیر جی کو کچھ تو گرنے کا کھسیانپن اور کچھ کھیت نہ ملنے کا غم بیچارے کا بہت ہی بُرا حال ہوا۔ غضب تو یہ ہے کہ ایسے جھوٹوں نے سچوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے۔ تو اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جسے رہبر محقق مل جائے وہ رہبر کسی کے بتانے سے نہ بناؤ۔ بلکہ علامات سے خود منتخب کرو۔ اور چند علامتیں ہیں بس اُنھیں سمجھ لے۔ اس کے بعد انتخاب آسان ہو جائیگا سب سے پہلے تو یہ دیکھو۔ کہ

اُسے علم دین ہے یا نہیں۔ اور یہ ضرور نہیں کہ وہ عربی ہی جانتا ہو۔ چاہے اردو فارسی ہی جانتا ہو یا یہ بھی نہ جانتا ہو۔ مگر بقدر حاجت دین کے احکام سے واقف ہو۔ مگر اسکا مطلب بھی نہیں کہ صرف راہ نجات ہرنی کے قصہ ہی کا عالم ہو۔ بلکہ عقائد۔ دیانات معاملات معاشرات اخلاق۔ سب شعبوں کو اچھی طرح جانتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے یا نہیں۔ سو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ چند روز اُس کے پاس رہکر دیکھو کہ ہر امر میں اپنی معلومات سے مریدوں کی اصلاح کرتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پاس نہ رہ سکو تو وقتاً فوقتاً خط و کتابت سے پوچھتے رہو۔ اگر اسے ضروری مسائل بھی معلوم نہ ہو تو اُس کو تو چھوڑ و دوسرے کی تلاش کرو۔ اور دوسری علامت یہ ہے کہ وہ خود بھی شریعت پر عامل ہو۔ تیسری علامت یہ کہ اُسے عادت ہو طالبین کو امر و نہی کرنے کی سختی سے یا نرمی سے۔ چوتھی یہ کہ اُس کی صحبت میں روز بروز حق تعالےٰ کی محبت بڑھتی ہو اور دنیا کی محبت گھٹتی ہو۔ پانچویں علامت یہ ہے جو بزرگوں سے سنی ہے۔ کہ اُس کی طرف عوام و اہل دنیا کا رجحان کم ہو اور اہل علم و اہل فہم و صلحاء کا رجحان زیادہ ہو۔ اور جس کی طرف عوام اور دنیاداروں کا رجحان زیادہ ہو وہ کامل نہیں ہے۔ پس جس میں یہ پانچوں علامتیں مل جاویں اُسے غنیمت سمجھنا چاہیئے اُس کا اتباع مطلق کرنا چاہیئے۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کے حکم کا منتظر رہے بلکہ خود بھی پوچھتا رہے۔ مثلاً یہ دیکھے کہ میرے اندر تکبر ہے اُس کا علاج پوچھے۔ کینہ ہے علاج پوچھے۔ غصہ ہے۔ غیبت کی عادت ہے اُس کا علاج پوچھے یا مال کی محبت ہے کہ فقیر کو دیتے ہوئے دم نکلتا ہے اُس کا علاج پوچھے کیونکہ کوئی باطنی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو اس لئے سب کو پوچھنا چاہیئے۔ اور جو نہیں پوچھتا وہ گویا اپنے کو بیمار نہیں سمجھتا۔ یہ علامتیں اس لئے میں نے بتادیں کہ بہت سے پیر بھی ایسے ہیں کہ۔ ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عز و جل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — و ز درونت ننگ میدارد یزید

اوران امراض کے علاج سے جیسا مریدوں کو بے فکر نہ ہونا چاہئے شیوخ بھی بے فکر نہ رہیں اس لئے کہ جس طرح ہم بیمار ہیں. اسی طرح بعض اوقات شیوخ بھی بیمار ہو جاتے ہیں اور اس میں تعجب ہی کیا ہے کیا حکیم بیمار نہیں ہوتے. بلکہ یہ تو ایسے بیمار ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ اُن کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے. وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی طب کے گھمنڈ پر بد پرہیزی بہت کرتے ہیں. اسیطرح شیوخ ہیں کہ اُن کی بیماری عوام سے بڑھکر ہوتی ہے. ان کے واسطے علاج کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ بزرگوں کی کتابیں دیکھیں اور اُن سے اپنا علاج کریں. اور یہ کتابیں منتہی کو تو کافی نہیں ہوتیں مگر منتہی کو کافی ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ فن جانتا ہے. اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں جسے اہل دیکھے اُس سے رجوع کرے. ایک علامت شیخ کامل کی یہ بھی ہے کہ تو دیکھے کہ اُس کے پاس بیٹھنے والوں میں اکثر کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی ہے یا نہیں. اگر اکثر کی حالت بہتر ہو تو وہ شیخ کامل ہے گو سب کی نہ ہو کیونکہ للاکثر حکم الکل اور اگر اکثر کی خراب ہو اور ایک آدہ کی اچھی ہو تو وہ شیخ کامل نہیں اُس سے ہرگز رجوع نہ کرے ورنہ یہ بھی ناقص ہی رہے گا کیونکہ جب پیر میں کمال نہیں اس میں کہاں سے آجائے گا. ایسا ہی ہوگا. جیسے ایک مرید نے کہا تھا ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے رامپور وہاں کا ایک شخص کسی پیر کا مرید ہو گیا. اُس سے کسی نے پوچھا میاں کچھ ملا بھی. تو اُس نے کہ میاں جب سفاوہ ہی میں کچھ نہ ہو تو بدھنی میں کہاں سے آوے. اور واقعی جب پیر ہی کی حالت درست نہیں ہے تو بے چارے مرید کی کب اصلاح ہوگی. غرض جس کے مریدوں میں اکثر کی حالت درست ہو وہ کامل ہے یہ علامت دیکھکر تب اُس سے اصلاح کا تعلق کرے اور اس کے متعلق ایک اور ضروری تنبیہ ہے. وہ یہ کہ اگر اُس میں سب علامات ہیں اور اُس کی تعلیم و صحبت سے اکثر کی حالت درست بھی ہے. مگر خود اس مرید کی حالت درست نہیں ہوتی تو اس سے یہ تو نہ سمجھے کہ شیخ کامل نہیں ہے لیکن شیخ سے اپنی اس حالت کا ذکر کرتا رہے. اور جب ایک معتدبہ مدت گذرنے پر

بھی حالت درست نہ ہو تو بدگمانی تو جب بھی نہ کرے۔ لیکن اُس وقت یہ سمجھے کہ مجھے اس سے مناسبت نہیں ہے پھر اور کوئی مناسبت کی جگہ تلاش کرے اور شیخ سے بھی کہدے۔ اگر شیخ محقق ہے تو وہ فوراً دوسرے سے رجوع کرنے کی اجازت دیدے گا۔ اور اگر دوکاندار ہے تو مکدر ہوگا۔ تو اس حالت میں وہ واجب الاتباع بھی نہیں۔ دوکاندار کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے طالب کی کتنی ہی پریشانی و ناکامی بڑھ جاوے مگر یوں کبھی نہ کہیں گے کہ میں تمھارے لئے کافی نہیں۔ اور سے رجوع کرو۔ جیسے مدعی طماع طبیب کہ چاہے مریض مرہی جاوے۔ مگر اپنے علاج کے قاصر ہونے کا کبھی اقرار نہ کریں گے۔ جیسے ایک جاہل حکیم کا قصہ ہے کہ اس نے کسی مریض کو بڑا سخت مسہل دیدیا تھا۔ تیماردار نے خبر دی۔ کہ حکیم جی دست بہت آرہے ہیں کہا آنے دو مادہ بہت ہے اچھا ہے نکل جاوے۔ جب اور زیادتی ہوئی پھر اطلاع کی گئی۔ پھر یہی جواب ملا غرض بار بار اطلاع ہوتی رہی اور حکیم جی یہی کہتے رہے کہ مادہ سخت ہے نکلنے دو۔ یہاں تک کہ ضعف کے مارے مریض کا دم نکل گیا۔ اس کی بھی اطلاع ہوئی تو حکیم جی کیا کہتے ہیں۔ اللہ رے مادے جس کے نکلنے سے مرگیا خدا جانے رہتا تو کیا ہوتا۔ ارے منحوس مرنے کے بعد اور کیا ہوتا شاید دو زخی بنا دیتا۔ تو حضرت ایسے ہی بعضے طبیب روحانی بھی ہوتے ہیں محض اناڑی۔ جیسے دھلی میں کسی پیر نے ایک مرید کو حبس دم بتایا تھا۔ اب اُسے تکلیف ہوئی اُس نے اطلاع کی کہا گئے جا مجاہدہ میں تو تکلیف ہوتی ہی ہے یہاں تک کہ اُس غریب کا دم نکل گیا تو کیا چلو شہید ہوا۔ میں کہتا ہوں بے شک شہید ہوا۔ مگر خبر بھی ہے کہ شہید وہ ہوتا ہے جسے کوئی ظالم قتل کرے تو یہ پیر ظالم ہوا۔ اسی لئے اس طریق میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جلدی سے کسی کو پیر نہ بنانا چاہئے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　پس بہر دستے نباید داد دست

اور ایک جگہ علامات کے باب میں فرماتے ہیں۔ ؎

کار مرداں روشنی و گرمی ست　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

روشنی سے مراد معرفت اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جس میں معرفت اور محبت کامل ہو اُس کو شیخ بناؤ اور معرفت کے لوازم میں سے ایک یہ امر بھی ہوگا کہ اگر کسی عارض کے سبب اس سے نفع نہ ہو مرید کو دوسری جگہ جانے کو فوراً کہدے گا۔ ورنہ بے چارہ مرید ہی میں دس کھوٹ نکال کر حیلہ بہانہ کر دے گا ایک شیخ کامل محقق کا واقعہ بیان کرتا ہوں ہمارے دادا پیر حضرت میانجی صاحب سے کاندہلہ کے ایک عالم بیعت ہوئے جو پہلے مخالف تھے۔ پھر موافق ہو گئے تھے۔ اور مخالفت کے زمانہ میں حضرت میانجی صاحب کی شان میں گستاخی کیا کرتے تھے۔ میانجی صاحب نے بیعت تو کر لیا اور طریق کی تعلیم بھی شروع کی۔ مگر چند روز کے بعد خود ہی فرما دیا۔ کہ مولانا اس طریق کی بنا محض صدق و خلوص پر ہے۔ اس لئے میں بے تکلف کہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفع نہ ہو گا جس وقت میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اُسیوقت آپ کے وہ پچھلے کلمات دیوار آہنی بنکر سامنے آجاتے ہیں۔ آپ کسی دوسرے سے رجوع فرماویں۔ اور میں دعا کرتا ہوں۔ آجکل خود تو کیا کسی دوسرے کے پاس بھیجیں گے۔ اگر کوئی خود سے بھی چلا جائے تو اس قدر ناراض ہوتے ہیں کہ گویا مرتد ہو گیا۔ تو شیخ محقق کی یہ شان ہوتی ہے۔ غرض جب شیخ کا انتخاب کر چکے جس کی یہ علامات ہیں۔ جو مذکور ہوئیں تو اب اُس کا کامل اتباع کرے کہ جو وہ کہے وہ کرے۔ اور جو مرض وہ بتائے اُس کا علاج کرے اور خود سے بھی اپنے امراض کا اظہار کرتا رہے اس بھروسہ نہ رہے کہ شیخ کو خود کشف سے معلوم ہو گیا ہو گا۔ اول تو یہ ضروری نہیں دوسرے جب طبیب سے مزید اطمینان کے لئے نبض وقارورہ دکھا دینے کے بعد بھی حال بیان کرتے ہیں۔ تو یہاں بھی ایسا ہی کرو یہ بھی تو طبیب روحانی ہے تیسرے مانا کہ بغیر کہے پیر کو انکشاف ہی ہو گیا ہو مگر بغیر کہے اُسے آپ کی طلب کیسے معلوم ہو گی۔ اور بغیر طلب کے تو حق تعالیٰ بھی متوجہ نہیں ہوتے انلز مکموھا

وَاِنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ یعنے اگر تم ایک مرتبہ ہماری رحمت سے بھاگتے ہو تو جاؤ ہم ہزار دفعہ مستغنی ہیں۔ اور طالب کے لئے یہ وعدہ ہے من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیہ باعا۔ تو طالب کی طرف خود اس قدر متوجہ ہوتے ہیں کہ اس کی ذراسی حرکت پر وہ خود برسوں کی مسافت طے کر دیتے ہیں اسیکو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالا و پست

تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

حضرت فرید الدین عطار فرماتے ہیں۔ ؎

گر تو ہستی طالب حق مرد راہ　　درد خواہ و درد خواہ و درد خواہ

پھر مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

اور فرماتے ہیں۔ ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزموں را یک زمانے خاک باش

ان سب میں طلب ہی کی ترغیب ہے۔ کہ تم خود بھی تو طلب ظاہر کرو۔ ایک شخص کے متعلق حاکم چاہتا ہے کہ اُسے تحصیلدار کر دے۔ مگر چاہتا یہ ہے کہ یہ بھی تو منہ سے کہے۔ وجہ یہ کہ اگر یوں ہی مل جائے گی۔ تو قدر نہیں کرے گا۔ ؎

ہر کہ اوارزاں خرد ارزاں دہد　　گوہرے طفلے بقرص نان دہد

تو اگر شیخ صاحب کو کشف بھی ہو تب بھی آپ کی طرف سے بھی تو طلب ہو۔ جب طلب ہوگی تب ہی عنایت ہوگی۔ یہی اصلاح اخلاق فقیری ہے۔ طریق حق جس کے لئے لوگوں نے ایک الگ جماعت تجویز کر رکھی ہے۔ اور جس کی تعریف یہ گھڑ رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کام سے تعلق نہ ہو۔ حالانکہ اس فقیری کی یہ تعریف

ہے۔ اتقوا اللہ حق تقاتہٖ۔ یعنے اللہ سے ایسا ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے حق تقاتہٖ کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ یطاع ولا یعصی۔ یطاع کے معنے ہیں اطاعت کیا جاوے یہ طوع سے ماخوذ ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت اور خوشی کو۔ تو اطاعت خوشی سے کہنا ماننا ہوا۔ اب سچ کہو کہ کیا کسل کے وقت نماز رغبت سے پڑھی جاتی ہے۔ بخل کے وقت زکوٰۃ خوشی سے دی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ بس اسی کی کسر ہے ہماری غلامی میں۔ تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسا بھی درجہ ہے جس میں اعمال شرعیہ طبیعت ثانیہ بنجاویں کہ بے تکلف خوشی سے ادا ہونے لگیں اور یہ ہے وہ درجہ جو کنز و ہدایہ میں نہ ملے گا۔ بلکہ وہ تو اس طرح ملے گا۔ ~~~ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

گر تو سنگ خارہ و مرمر شوی　　چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

یہ انھیں اہل دل کی صحبت کا اثر ہے کہ پتھر کو گوہر بنا دیتے ہیں۔ اس دولت کی تحصیل کے لئے اُن کا اتباع ضروری ہے وہی دل کی اصلاح کرتے ہیں جس کے متعلق ارشاد ہے۔ اذا صلحت صلح الجسد کلہ الحدیث اور جب اصلاح قلب پر تمام تر اصلاح موقوف ہے۔ تو اس کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہوگیا۔ کیا یہ حدیث اس حکم کے افادہ کے لئے کافی نہیں ہے یقیناً کافی ہے۔ تو اب یہ کہنا کہ اس طریق کی پیروی کرنا سب کے ذمہ فرض و واجب نہیں۔ جیسا کہ اس شعبہ کو اکثر لوگوں نے دین میں غیر ضروری قرار دے رکھا ہے۔ بالکل غلط ٹھیرا۔ لیکن اس میں دنیا کے چھوڑنے اور بیوی بچوں سے منہ موڑنے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی سے تو لوگوں کو توحش ہوا ہے۔ اور اسی سے اس کو دین سے علحدہ سمجھا ہے۔ سو ایسا نہیں بلکہ اسی عیش و راحت کی حالت میں طریق طے ہو سکتا ہے۔ ~~~ ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد　　بہ تدبیر عبید اللٰہی آمد

محققین شاہانہ لباس کے ساتھ بھی تم کو درویش بنا دیں گے اور بعضوں نے
جو اچھا لباس چھوڑ دیا وہ اُن کا غلبۂ حال تھا۔ جیسے بعض لوگوں کی بیوی مرجاتی
ہے تو بچوں کی محبت میں دوسری بیوی نہیں کرتے۔ اور جن پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا
وہ بوڑھے ہو کر بھی نکاح کرتے ہیں گو لوگ اُن کو ہنستے بھی ہوں۔ مگر اُن کا کیا
ضرر ہے آرام تو ملے گا۔ ہنسنے پر ایک بڑے میاں کا قصہ یاد آیا۔ ایک نوے
سال کے بوڑھے نے جوان کنواری بچی سے نکاح کیا تھا۔ رات کو ماما صاحبہ
آئیں کہ لڑکے کو گھر میں بلاتی ہیں۔ ماشاء اللہ کیسے اچھے لڑکے ہیں۔ جن کی
ڈاڑھی سفید گالا ہو چکی ہے کچھ دانت بھی گر چکے ہیں۔ اور ساس جن کے
ابھی بال بھی سفید نہیں ہوئے وہ بڑے میاں سے کہتی ہیں۔ بیٹا میں تمہیں بیٹی
دیتی ہوں۔ بیٹا کیا کہتے ہیں کہ اجی اماجان آپ یہ کیسا کہتی ہیں۔ لونڈی نہیں
میں تو بجائے بیٹی کے رکھوں گا۔ تو غرض جس طرح بعضے نکاح کرتے ہیں بعضے
نہیں کرتے بس اسیطرح بعضے بزرگوں نے دیکھا کہ ہم خالق و مخلوق دونوں
کے حقوق کو جمع نہ کر سکیں گے۔ اُنھوں نے تعلقات خلق کو چھوڑ دیا۔ ورنہ
اس طریق میں فی نفسہ یہ مانع نہیں ہے۔ بس ہر شخص کے لئے ضرورت
ثابت ہوئی کہ اپنے باطن کی درستی کرے اور اس کے لئے کچھ بیعت ہی کی
ضرورت نہیں۔ بلکہ اس میں تو بعض دفعہ مضرت ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں پھنس
گئے تو بس بعد میں بیچ بھر رہے ہیں کہ انبوجو ہو گیا سو ہو گیا۔ اور ایسے بہت
کم ہیں۔ جو متنبہ ہو کر اپنے کو اُس ورطہ سے نکال لیں بلکہ خود پیر کو بھی متنبہ کر دیں۔ جیسے
ایک دیندار مرید نے ایسی جرأت کی لطافت کے ساتھ۔ وہ دھوکہ میں آکر ایک دنیا
دار پیر کے ہاتھ میں پھنس گیا۔ اُس نے چاہا کہ پیر کی حالت پیر کے کان میں ڈالے
چنانچہ ایک بار پیر صاحب سے کہا آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ کہ میری
انگلیاں گوہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی شہد میں۔ پیر نے کہا کیوں نہ ہو تم دنیا
کے کتے ہو خباثت میں بھرے ہو۔ اور ہم بحمد اللہ پاک صاف و شیریں ہیں

کہا حضور ابھی خواب کا ایک جزو باقی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی اُنگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری۔ اصل میں اُس نے لطافت سے یہ بات پیر کے کان میں ڈالی کہ آپ مجھ سے دنیا حاصل کر رہے ہیں اور میں آپ سے دین۔ تو بعض وقت اس طرح سے پھنس جاتے ہیں اس لئے بیعت میں جلدی نہیں چاہیئے۔ پہلے خوب پیر کو اچھی طرح جانچ لے اور جانچنے کی صورت قابل اطمینان یہی ہے کہ چندے پاس رہے بلکہ اُس میں بھی اچھی صورت یہ ہے کہ اُس کے وطن میں جا کر رہے اور اگر پاس رہنے کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم برس دو برس خط و کتابت ہی کرے اور اس میں اپنے امراض لکھے اور اُن کا علاج پوچھے۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو جاوے کہ نفع ہوگا تب بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔ یہ ہے بیان شعبہ اخلاق کا۔ اور اسی پر اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں۔ اور مختصر الفاظ میں تمام بیان کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں۔ وہ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کے معنے ہیں عبد شدن۔ یعنے غلام ہو جانا اور غلام اُسیکو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی تمام اوامر و نواہی میں اطاعت کرے۔ اور وہ اوامر و نواہی یہ ہیں کہ اپنے عقائد درست کیجئے۔ اعمال درست کیجئے۔ معاملات اور معاشرت درست کیجئے۔ اخلاق کی اصلاح کیجئے۔ اور یہ موقوف اس پر ہے کہ علم دین کی کتابیں دیکھا کیجئے۔ خود بھی دیکھئے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیے اور اپنے دیکھنے میں جہاں سمجھ میں نہ آوے کسی عالم سے تحقیق کیجئے۔ اور کسی زندہ اہل اللہ سے تعلق رکھئے اور اُس سے اپنے امراض کا علاج پوچھتے رہئے۔ اور عمل کرتے رہیے انشاءاللہ اس طور پر بہت جلد کمال دینی حاصل ہو جائے گا۔ اور اُس وقت آپ عبد کہلانیکے مستحق ہوں گے۔ بس اب میں ختم کر چکا۔ حق تعالیٰ سے علم و عمل اور فہم و توفیق کی دعا کیجئے۔ فقط دعاء

تمّت

مختصر فہرست کتب دفتر اشرف المطابع تھانہ بھون

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
المصالح العقلیہ حصہ اول ۔	۹ر	نشر الطیب ۔ ۔ ۔	عہ
ایضاً حصہ دوم	۱۲ر	الدر المنضود حصہ اول ۔	۱۰ر
ایضاً حصہ سوم	۱۲ر	تربیۃ السالک حصہ اول ۔	۵ر
تسہیل قصد السبیل ۔	۳ر	ایضاً ۔ حصہ دوم	۵ر
تحذیر الاخوان عن الربوا فی الہندوستان	۵ر	تغییر العنوان ۔ فی بعض عبارات	
تنویر السراج فی لیلۃ المعراج ۔	۱۰ر	حفظ الایمان ۔	۱۰ر
مناجات مقبول مدلل ومکمل جدید الطبع		نیک بیبیاں ۔	۵ر
سادہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۰ر	الجواب المتین فی احادیث سید المرسلین	۵ر
ایضاً حناشدہ ۔	۱۲ر	کرامات امدادیہ ۔	۲ر
بہشتی زیور مدلل ومکمل جدید الطبع معہ		التیسیر المبتدی کامل ۔	۲ر
حوالجات وضمائم ۔	سے	ایضاً صرف حصہ فارسی ۔	۲ر
تکمیل الیقین خلاصہ سائنس واسلام	عار	شمائل شریف معریٰ کارڈ سائز	عہر
اصلاح الرسوم ۔	۶ر	شمائل شریف مترجم معہ خلاصہ	
آداب المعاشرت ۔	۲ر	بیان القرآن ۔	للعہ
اصلاح انقلاب حصہ اول ۔	عہ	الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد	۳ر
اعمال قرآنی ہر سہ حصہ ۔	۵ر	اوراد رحمانی	۳ر
تعلیم الدین ۔	۸ر	جمال القرآن معہ ضمیمہ ۔	۲ر

المشتہر

احقر محمد شبیر علی مدیر رسالہ النور ومالک اشرف المطابع تھانہ بھون ضلع مظفر نگر